دوسری کرن

ویریندر پٹواری

DOOSRI KIRAN (SHORT STORIES)

BY VEERINDER PATWARI, PRICE: 35

دوسری کرن

(کہانیاں)

ویریندر پٹواری

موڈرن پبلشنگ ہاؤس

۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج

نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

© ویریندر پٹواری
پریم کنج، حضوری باغ
تالاب تلو، جموں توی-۱۸۰۰۰۲

قیمت : پینتیس روپے
کتابت : جمال گیاوی
طباعت : نیو کلر پریس۔ دھلی
سرورق : راجندر پٹواری

زیر اہتمام :
پریم گوپال متّل

ناشر: موڈرن پبلشنگ ھاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج نئی دھلی-۲

اپنے پیارے والدین

پنڈت پریم ناتھ پٹواری

اور

شریمتی دھنّہ وتی پٹواری

کے نام ——

کبھی کبھی

خلاؤں میں گھور گھور کر

یا گرد و پیش نظریں دوڑا کر

میں یوں محسوس کرتا رہتا ہوں ——— جیسے!

جیسے میرے سامنے ایک کینواس ہے۔ کورا کینواس!

دھرتی کی طرح بڑا۔ آکاش کی طرح پھیلا ہوا ———

ہر طرف رنگ ہی رنگ بکھرے پڑے ہیں۔

کچھ شوخ۔ کچھ پھیکے۔

کچھ لہو کی طرح لال، انگاروں کی طرح چمکیلے

اور کچھ مسلے کچلے بدن کی طرح زرد ———

میرے ہاتھ میں ایک برش ہے۔

اتنا چھوٹا کہ کسی دلہن کے جوڑے پر گلکاری کر سکوں۔

اور کبھی اتنا بڑا کہ سمندر میں ڈبو کر۔ آکاش میں تیرتے

ہوئے بادلوں کے ٹکڑوں کو ایک سنگ تراش کی طرح

تراش سکوں ———

اور یوں میں برش کے سٹروکس لگاتار رہتا ہوں ـــــ
میرے کینواس پر نت نئی تصویریں اُبھر کر سامنے
آتی رہتی ہیں۔
کچھ اچھی۔ کچھ بُری۔
کچھ دلکش۔ کچھ ڈراؤنی۔
پھر ـــــ
تنہائیوں میں اکثر۔
جب یہ تصویریں میرا تعاقب کرتی رہتی ہیں
تب میں
ان تصویروں کو الفاظ کا لبادہ پہنا کر
قید کر دیتا ہوں۔
فقط یہ سوچ کر کہ شاید۔
کبھی۔ اور کہیں
کوئی شناسا چہرہ دیکھ کر
میری تصویریں بول پڑیں ـــــ

ویریندر پٹواری ـــــ

اَندرُونِ صَفحات

بے

پیش لفظ

آج کے تاجرانہ ماحول میں کوئی نووارد سود و زیاں کی سرحدیں پھلانگ کر شوق و جنوں کے مقامات میں گھومتا ہوا نظر آئے تو اسے بے اختیار دعائیں دینے کو جی چاہتا ہے۔ ویومیک رسپواری پیشہ کے اعتبار سے انجینیئر ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ پورا حساب جوڑ جوڑ کر اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہوتے ہوں گے، مگر وہ اپنے دل کا کیا کریں، جس کی بدولت وہ تعمیر سے تخلیق کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں، جہاں آتے آتے آدمی اپنا تامل اور تحفظ کہیں پیچھے چھوڑ آیا ہوتا ہے اور اپنے آپ کو اوروں میں دونوں ہاتھوں سے بانٹ رہا ہوتا ہے۔ پٹواری کی کہانیوں میں بھی سب سے پہلے محبت اور آشتی اور خیر خواہی کی قدریں اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں اور ان قدروں کے استحکام

کے لیے اُس کی بے چینیاں محسوس کو کر کے اُمید بندھتی ہے کہ نئے انسان میں ابھی اپنی نیک خواہشات اور اعمال کا خمیر باقی ہے اور اس لیے انسانی انحطاط و زوال کی مدافعت کے خاطر خواہ اسباب ابھی بنے رہیں گے۔

آخری محاسبے میں ہر تخلیقی کاوش ادبی فنی اہتمام کے باوجود اُس وقت تک دم نہیں پکڑتی جب تک اُس میں انسانی ضمیر کی استطاعت پیدا نہ ہو۔ بیٹواری کے امکانات میں اس استطاعت کو بڑا دخل حاصل ہے۔ اُس نے اپنی تحریروں کو بے وجہ ہیئتی تجربوں میں جھونکنے کی بجائے سیدھے سیدھے اپنی سچی واردات پیش کی ہیں اور اپنی پیش کش میں بھرپور شرکتوں کا احساس دلواتا ہے۔ جب کسی لکھنے والے کا مسئلہ محض بیان کرنا نہ ہو، بلکہ شریک ہونا ہو تو اُس کی تخلیقی سرگرمی ہوتے ہوتے آپ ہی آپ اُسے اپنے مخصوص فنی لوازم کی مناسب سمتوں سے روشناس کروا دیتی ہے۔ زیرِ نظر مجموعے کی "ڈرپوک"، "دشمن" یا "سوال" جیسی راست کہانیوں سے شاید میری اِس رائے کی اہمیت واضح ہو جائے۔

بعض لکھنے والے اتنے ادبی ہو جاتے ہیں کہ زندہ انسانوں کے مانند کھل کر سانس لینے، سوچنے اور محسوس کرنے سے قاصر معلوم ہوتے ہیں اور یُوں زندگی کی متحرک سطحوں سے بے دھڑک موضوعات اُٹھانے کی بجائے ادب سے ہی اپنا سارا ادبی زادِ راہ حاصل کرتے ہیں، جس سے اُن کے یہاں زیادہ سے

زیادہ بس ایک طرح کی مؤنث صفت، بے بس نفاست کا ھی گمان ہوپاتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ بٹواری کے نزدیک ادب صرف زبان و بیان کا کھیل نہیں، بلکہ از کتاب کی مذکر صفت جرأتوں سے عبارت ہے۔ ادب میں ایسی جرأتوں کو مستحسن قرار نہ دیا جائے تو کوئی بھی فعّال سماج اسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا اور اس طرح یہ گھٹ گھٹ کر بے محل ہو کر رہ جاتا ہے۔

یہ امر بھی اہم ہے کہ بٹواری ابھی عین بچوں بیچ ہیں، اور اپنی موجودہ تخلیقی جہد میں دور تک پہنچ پانے کے ثبوت فراہم کر رہے ہیں۔ "فیصلہ" اور "دوسری کرن" کی آزمائشیں ظاہر کرتی ہیں کہ اپنا ارتقائی سفر طے کرکے بٹواری کیونکر آبدوز مقامات کو بھی جا لیں گے۔ کسی بھی فن کار سے توقعات کی وابستگی کا مدار اس پر ہوتا ہے کہ اُس کا کنجان تر وارداتوں کا حوصلہ بنا رہے۔ اِس لحاظ سے بٹواری کی انتھک شرکتوں اور کچھ کر گزرنے کی شدید چاہ کے باعث یقیناً اُن کے فن کے ایک نئے اور برتر باب کا آغاز ہوگا۔

مجھے اُن دِنوں کا انتظار ہے۔

۲۹ اپریل، ۷۸ء

ای ۵۸۷، گرمیٹر کیلاش ۲،

نئی دھلی - ۱۱۰۰۴۸۔

جوگندر پال ـــــــ

الف

اپنے چھوٹے بھائیوں

جناب راجندر پٹواری

اور

ڈاکٹر اشوک پٹواری

کے نام ——

فیصلہ

بوڑھا کھڑکی سے جھانک کر دیکھ رہا تھا اور بوڑھے کے بیٹے بیٹیاں، پوتیاں پوتے اُس کے اِرد گرد بیٹھ کر اُس کے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔ بوڑھا ان سب کو آنکھوں دیکھا حال سُنا رہا تھا گویا سنجے مہابھارت کا آنکھوں دیکھا حال سُنا رہا ہو۔ بوڑھی ان سب سے الگ تھلگ ایک چھوٹے سے بچے کو گلے سے لگا کر دہلیز پر بیٹھی دُور دُور تک نظریں دوڑا کر سمندر کو دیکھ رہی تھی —— غالباً وہ کسی کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ بے صبری سے اپنے پھولتے ہوئے سانسوں کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے۔

لڑائی جاری تھی اور مقابلہ سخت تھا۔

دونوں جب ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے تھے تو زمین کانپ جاتی تھی۔ آسمان

تھرتھرانے لگتا تھا اور دونوں کی آوازیں یوں گونجتی تھی جیسے بادلوں کی گرج یا آتش فشاں پہاڑ پھٹ جانے کی آوازیں۔

مقابلہ برابر تھا اور بوڑھا تذبذب میں تھا کہ فیصلہ کس کے حق میں دیا جائے کیونکہ ایک نے للکارا تو دوسرے نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ حملہ اور جوابی حملہ برابر جاری تھا۔

"شطرنج کی بازی جیت کر اتنے مغرور ہو گئے۔ توڑ دوں گا تمھاری انا کی اونچی اونچی دیواروں کو۔"

"میرے قلعے ریت پر نہیں بنے ہیں۔ میرے قلعے کی اونچی اونچی فصیلیں دیکھنے کی کوشش مت کرو۔ سر پر رکھا تاج گر جائے گا راجے!"

"راجے نہیں۔ مہاراجے کہو گستاخ۔"

"ہا۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔"

"دانت دکھانے کی بجائے اپنی طاقت آزماؤ۔"

"تمھاری جوانی پر ترس آ رہا ہے۔"

"تمھارے بڑھاپے پر ترس کھانا سانپ کو دودھ پلانا ہے۔"

"خبردار! —— یہ جنگ کا بگل ہے!!"

اور دونوں لڑتے رہے۔

جیسے رستم اور سہراب۔

اور پھر بھیانک جنگ۔ گھمسان کی لڑائی۔

دنگل۔ کشتیاں۔ تلوار بازی۔ نیزہ بازی۔

تیر کمان —— زہریلے تیر چلا کر

گھوڑوں پر سوار ہو کر۔

اُونٹوں پر سوار ہو کر۔
ہاتھیوں پر سوار ہو کر۔
زرہ بکتر پہن کر۔
سمندری بیڑے لے کر
کوروکشیتر کے میدان میں
پانی پت کے میدان میں۔
سمندر میں۔
صحرا میں۔
فضا میں
مہابھارت۔ کالنگا۔ واٹرلو اور جنگِ عظیم
جرّار لے کر۔
توپیں لے کر۔
بَم لے کر۔
اور مقابلہ جاری تھا۔
کون غازی، کون سُلطان۔
کون عظیم —— کون مہان
کون شہید —— کون غدّار
بوڑھا تذبذب میں تھا کہ کس کے حق میں فیصلہ دیا جائے۔
پھر پوشاکیں بدلتی رہیں۔
مقابلے کے طور طریقے بدلتے رہے۔
جب عیّاری اور مکّاری کا استعمال ہوا تو بُوڑھا ہنس پڑا۔

غالباً اس لیے کہ دونوں نے ایک دوسرے کے لبادے تار تار کر دیے اور دونوں ننگے ہو گئے۔ الف ننگے۔

پھر بھوت کی دھند پھیلائی گئی۔ افواہیں اڑائی گئیں مذہب کے نام پر ——
رنگ و نسل کے نام پر۔

مقابلہ ہوتا رہا اور بوڑھا آنکھوں دیکھا حال سناتا رہا۔

مقابلہ برابر تھا۔

کوئی میدان چھوڑ کر بھاگا نہیں۔ مگر دونوں جھاڑیوں کے پیچھے چھپ کر۔ ایک دوسرے پر کڑی نگاہ رکھنے لگے۔

طیّاروں میں گشتی اُڑان کرتے رہے۔ اور پھر اچانک ——
جنگ میدان سے ہٹ کر بند کمروں میں جاری رہی۔

سرگوشیانہ انداز میں۔

وضع داری کا اعلیٰ ترین مظاہرہ کرتے ہوئے ——

عالمانہ انداز میں۔

مفکّروں کا ساتھ لے کر۔

فلسفوں کی چاشنی میں خود غرضی کی ملاوٹ کرتے ہوئے۔

ٹکر برابر ہی!!

گلاس سے گلاس ٹکرا کر دونوں مسکراتے ہوئے کہتے رہے۔

"خون خرابہ ٹلنے کی کوشش کیجیے جناب۔ فقط یہ سمجھ کر کہ آپ بکری ہیں اور میں شیر —— شیر ببر!

ملک کون ہے یہ سبھی جانتے ہیں۔ اور آپ یہ جان لیجیے کر میں شکاری کتّا ہوں؟"

"تو آرنج کا حوالہ دے کر اپنی مونچھوں پر تاؤ دیے جا رہے ہیں۔"

"یہ تو سوچیے جناب کہ چوہوں کی بھی مونچھیں ہوتی ہیں۔"

"چوہے بڑی بڑی پھانکوں کو بھی کتر کتر کر کھوکھلا بنا دیتے ہیں۔"

"اس سے پہلے ہی میں سانپ بن کر تمھیں نگل جاؤں گا۔"

"اور میں نیولا بن کر تمھیں چبا ڈالوں گا۔"

"ڈیڈلاک" بوڑھا چلانے لگا۔ مگر جنگ جاری تھی۔

ہتھیاروں کا استعمال بند ہوا۔

مفاہمت کا بیج بھی بنجر زمین میں دب گیا۔

اور طاقت کا مظاہرہ جادوئی کرشمات کی شکل اختیار کر گیا۔

ایک جادوگر نے جادو کی شیشی میں جھانک کر دشمن کو دیکھ لیا تو دوسرے نے اپنے دشمن کے قدموں کی آہٹ ہزاروں میل دور رہ کر بھی سُنی۔

ایک جادوگر نے اپنے طلسم سے آندھی طوفان پیدا کر کے بستیاں اُجاڑ دیں۔ اور دوسرا سانپ بن کر اُجڑے گھروں میں گھسنے لگا۔

ایک طلسم سے ہاتھی بن گیا تو دوسرا مچھر بن کر مقابلے کے لیے آگے بڑھتا گیا۔ ہاتھی ایک جھٹکے کے ساتھ موتی کا ایک دانہ بن گیا اور جھاڑیوں کے پیچھے چھپ گیا۔ جیسے میگزین میں رکھا ایٹم بم۔

مچھر نے مُرغے کی شکل اختیار کر کے فوراً موتی کے دانے کو ڈھونڈ نکالا۔ اور اسے کھا گیا۔

کہانی ختم ——— بوڑھا چلانے لگا۔

بوڑھی چونک گئی۔ بوڑھے کی آواز سن کر نہیں ——— بلکہ ——— دُور سے قریب آتی ہوئی ایک کشتی دیکھ کر۔

بچے کہانی سے لُطف اندوز ہو گئے ——— گویا تواریخ کے اوراق پڑھ رہے ہوں۔ مگر جوان مرد عورتیں مُرغے کو دیکھتے رہے جو جھاڑیوں کے پیچھے چھپے ہوئے موتیوں کے ڈھیر کو ٹک ٹک کر کے کھاتا تھا۔

اچانک مُرغے نے اپنا پیٹ پھولتا ہوا محسوس کیا تو وہ فوراً مینڈک بن گیا۔ مینڈک کا جسم خوب پھول گیا اور ایک زور کا دھماکہ ہوا۔ تالاب میں کودنے سے پہلے مینڈک ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گیا جیسے ہیروشیما کی عمارتیں ——— ناگاساکی کا وجود۔

موتی کا دانہ پھر انسان بن گیا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ خاقان ہٹلر یا زمین آسمان چاند ستاروں کا مالک ہونے کا دعویٰ کرتا زمین ہلنے لگی اور وہ کانپنے لگا۔

بوڑھے نے چیخ کر کہا۔ "زلزلہ ۰۰۰ قہرِ خدا۔

بوڑھی نے کہا۔ "نہیں قہرِ آدم"

جوان مرد عورتوں نے چلّانا شروع کیا۔

"جنگ۔ جنگِ عظیم۔" اور بچے نہایت دلچسپی سے اُن کی باتیں سُنتے رہے۔

"زلزلے سے دو لاکھ لوگ مر گئے"۔ ایک آواز زمین کے کسی کونے سے اُڑتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

"اب تک جنگ سے چار لاکھ آدمی مارے گئے"۔

ہوائیں اپنے ساتھ ایک اور خبر لائیں۔

گاؤں تباہ ہوئے ———

شہر تباہ ہوئے۔

ساری ریاست ختم ہو گئی۔

نہ رہی سلطنت ——— نہ سلطان

مرنے والوں کی تعداد۔ دس لاکھ۔ دس کروڑ۔ دس ارب۔

بچوں نے معصوم انداز سے بوڑھے سے پُوچھا۔ آخری فتح کس کی ہوئی؟

"کوروں کی یا پانڈوں کی" —— ہٹلر کی یا سٹالن کی ——

رُوس کی یا امریکہ کی۔"

بُوڑھا خاموش رہا۔

مگر بوڑھی چلانے لگی۔

"جلدی کرو —— جلدی کرو۔ وہ آگیا ہے۔ وہ آگیا ہے۔ ساحل پر پہنچ چکا ہے ——"

بوڑھی کی آواز کسی نے نہیں سُنی —— شاید اس لیے کہ وہ ہر وقت بڑبڑاتی رہتی تھی۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں۔" ایک چھوٹے سے بچے نے توتلی زبان میں بوڑھی سے پوچھا۔ تو بوڑھی اپنی گود میں دو بچے ایک لڑکا ایک لڑکی اُٹھا کر ساحل کی طرف بہت ہی تیز رفتار جاتے ہوئے اس کارواں میں شامل ہوئی۔ جس میں پرندے بھی تھے جانور بھی۔ شیر بھی اور بکرے بھی۔

ابر آلودہ آسمان میں ایک سفید کبوتر اپنی چونچ میں ایک گندم کا خوشہ لیے اُڑتا رہا اور ایک عقاب اُس کا پیچھا کرتا رہا۔

جونہی بُڑھیا ساحل کے قریب پہنچ گئی، بوڑھے نے کھڑکی بند کردی۔

بُوڑھا خاموش تھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا اور خدا اپنا فیصلہ سُنا چکا تھا۔ اور ایک سفید پوش فرشتہ اپنا سفینہ لے کر ساحل پر پہنچ چکا تھا۔

بڑھیا نے سفینہ میں قدم رکھا تو سفید کبوتر بادبان پر جا بیٹھا۔

پرندے کی آواز سُن کر بوڑھے نے ادھ کھلی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو سفینہ حرکت میں آچکا تھا۔

○○

گھر

صبح گیارہ بجے

فلیٹ اچھا ہو تو پسند آ ہی جاتا ہے۔ میرے بھائی۔ یہ فلیٹ سوسائٹی والوں نے فقط فیملی والوں کے لیے بنائے ہیں۔ یہ فلیٹ فروخت ہوتے ہیں۔ ہاں یہی کوئی پچاس ہزار، مگر سنو۔ کرایہ پر بھی فلیٹ مل جائے گا۔ دو بیڈ رُوم والا چاہیے نا ——— ہے۔ ضرور ہے۔ بالکل ویسا ہی جیسے آپ نے ابھی دیکھا۔ کرایہ زیادہ نہیں۔ چھ سو روپے تک لے ہی لے گا۔ ایک بیڈ رُوم کے لیے پانچ سو روپے زیادہ ہے؟ ——— پھر فلیٹ کا خیال چھوڑ دو۔ کمرے کی تلاش کرو۔ ہوٹل میں یا کسی بستی میں۔ ارے بھئی! پتہ کسی ٹیکسی والے سے پوچھو۔ ہمارے ریٹ سوسائٹی

نے مقرر کیے ہیں - ایک کمرہ کہاں سے لاؤں - کیوں ملتجی نظروں سے دیکھ رہے ہو - شہر میں نئے آئے ہو کیا ——— ؟

صبح گیارہ بج کر پچاس منٹ

آئیے - آئیے مہربان - ہم آپ کا تہہ دل سے سواگت کرتے ہیں - ہاں فیملی کے لیے ہمارے پاس بہت بڑے کمرے ہیں - یہ دیکھیے جنّت ——— ! چونکیے گا مت حضور اس سیوٹ کا نام جنّت ہے - سُنا ہے جنّت میں ایک نہر ہے تسنیم - یہاں نہر تو نہیں ہے مگر ٹھنڈک ویسی ہے - دراصل جناب یہ ٹھنڈک کا احساس ہی اپنائیت کا یقین دلاتا ہے - ورنہ گھر میں اور کیا ہوتا ہے - اپنا پن ہی نا - تبھی تو ہمارے ہوٹل کا نام اپنا گھر ہے ——— ہوملی کمفرٹ جناب ! اور آپ کی تمام خواہشات کا احترام کرنا ہی ہمارا اوّلین مقصد ہے - کرایہ ؟ واجب ہوگا - ہا، ہا، ہا - آپ بڑے دل چسپ آدمی ہیں - کیوں، مذاق کر رہے ہیں آپ کیا ؟! مہینے کے نہیں ایک یوم کے ——— سو روپے مہینے پر تو کمرہ پرانی بستی میں بھی نہیں ملتا - میں کوئی گائیڈ ہوں جو تمہیں مشورہ دوں - چلو بھاگو یہاں سے - وقت برباد کر دیتے ہیں یہ لوگ !

دن کا ایک بجا

جی ہاں ! میں ہی دینو شاہ ہوں ——— فرمائیے - اچھا - اچھا - لو ٹھنڈا پانی پی لو - اس کڑکتی دھوپ میں کیوں آئے - شام کو آ جاتے - میں اور کہیں تو جاتا نہیں - خیر - آپ کو کمرہ چاہیئے، کمرے ہی کمرے ہیں - سامان لے کر کیوں نہیں آئے - اور پانی پی لو - ہونٹ سوکھ گئے ہیں - گھبراؤ نہیں، کرایہ زیادہ نہیں .. روپے

فی کمرہ - ٹھیک ہے نا - " سیڑھیوں کے ساتھ ہی تمہارا کمرہ ہے - ہاں ابھی مکمل نہیں ہے پھر ہو جائے گا - ساتھ والا کمرہ ایک ماہ میں بن گیا ——— چلو دو مہینے سہی پھر لے آنا اپنی - اچھا اچھا - ماں کو لانا چاہتے ہو، دو بھائی اور دو بہنیں! ٹھیک ہے - گزارہ ہو جائے گا - شہروں میں تو وقت کاٹنے والی بات ہے - تب تک! تب تک تم یہاں میرے کمرے میں چارپائی بچھا دینا - ہا - ہا - ارے بھئی عزیز ہو اپنے! نہیں نہیں - یہ عمارت کارِ خراب نہیں - تم جیسے لوگوں کا اپنا گھر ہے - بنایا بھی تم لوگوں نے ہے - ایڈوانس؟ ہاں ہاں دیتے جانا - مگر یہ کیا، ۷۰ روپے؟ نہیں نہیں عزیز سو روپے سے بھی کام نہیں چلے گا - تو کیا تم اپنے کمرے کے لیے دو ہزار روپے بھی نہیں خرچ کر سکتے - کمال ہے دنیا میں کیسے کیسے لوگ رہتے ہیں - حلق سوکھ گیا تو میں کیا کروں - وہ رہا میونسپلٹی کا نلکہ - شام کو پانی آئے گا - ہوں!!!

دن کے دو بجے

بھئی تنہا آدمی ہو - ہوٹل میں رہ نہیں سکتے - رقم خرچ نہیں کر سکتے - ترس تو آرہا ہے مگر کیا کروں - گھر میں بہو بیٹیاں ہیں - ماں بھائی، بہنیں اس چھوٹے سے کمرے میں نہیں رہ سکتے - مشکل سے تو ایک چارپائی - میاں بیوی کا گزر ہو سکتا ہے - نہیں - نہیں - آپ کے سمجھنے میں اور لوگوں کے کہنے میں بہت فرق ہے - کنوارے کو میں کمرہ نہیں دے سکتا -

دن کے تین بجے

اوّل تو فکر نہ کر یار - نئی سرکار اپنی سرکار ہے یار ——— ایک عالیشان کوارٹر دلائیں گے یار ——— وہ بھی نئی کالونی میں یار ——— او بن جائے گی

یار ـــــ درخواست لکھ یار ـــــ یہ لے کاغذ یار ـــــ او سگریٹ تو پلا
یار ـــــ یار میں خالی چائے نہیں پیتا ـــــ کھانا نہیں کھایا تو کچھ اور
منگوالے یار ـــــ آملیٹ منگوا دے یار ـــــ او تو فکر نا کر نا یار ـ تو
اکیلا تو نہیں ہے ـــــ میں تیرے ساتھ ہوں۔

دن کے پانچ بجے

بابو جی گھر گھر والوں سے ہوتا ہے۔ ورنہ ایک مکان ہوتا ہے۔ ہے کہ نہیں؟ مکان شاندار کیوں نہ ہو۔ عالی شان کیوں نہ ہو۔ لیکن گھر نہیں ہو سکتا۔ یہ دیکھو بابو جی۔ یہ رہا آپ کا گھر۔ ابھی کنوارے ہو نا ـــــ؟ ارے شامو دلال کی نظریں ایکسرے اتار لیتی ہیں۔ کہو کمرہ ٹھیک ہے نا؟ ارے کمال کرتے ہیں آپ بابو جی۔ برسات کا پانی اندر آ بھی گیا تو کیا ہوا۔ کم بخت برسات کیا بگاڑے گی تمھارا بابو جی۔ بجلی نہ سہی باز وہیں غسل خانہ سہی، بازار نزدیک نہ سہی۔ مگر گھر تو ہے اور مالکن بے چاری اکیلی ہے۔ نرم دل والی ہے۔ مہربان ہے۔ بیوہ ہے، جوان نہ سہی، خوبصورت تو ہے، اور کیا چاہیئے۔ غصے کیوں ہو رہے ہو بابو جی۔ گھر بھی دے رہا ہوں اور گھر والی بھی۔ کما یہ بری سہی۔ او، تو پھر شامو دلال کے پاس کیا لینے آئے تھے۔ جاؤ کسی سرائے کا دروازہ کھٹکھٹاؤ۔ مندر کے دوار پر دستک دو۔ بڑے آپ کو ڈیٹ بنے پھرتے رہتے ہو۔ دل ہی نہیں ہے تو دماغ خاک ہوگا۔

شام کے آٹھ بجے

ہاں۔ ہاں۔ یہ سرائے ہے مگر تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ کیوں آئے ہو۔ کیا کام کرتے ہو۔ ارے بھئی ملازم تو میں بھی ہوں۔ اچھا کلرک ہو۔ نئی نئی نوکری

ملی ہے۔ پھر بیڑی پیو۔ ہی۔ ہی۔ کمرہ! سارے کمرے خالی ہیں۔ دیکھا ہوں نا نمک حلال۔ بیڑی کا حساب ختم۔ چلو کیا یاد کرو گے۔ اجنبی ہونا بھی۔ سنو۔ انجل ٹیبوتل دبوچ کر اوپر کمرے میں جاؤ۔ کیا ملے گا؟۔ کمال ہے چابی ورنہ۔ ورنہ۔ سرائے میں کوئی کمرہ خالی نہیں۔ شادی کے لیے بک ہو چکا ہے۔ ارے شادی نہ سہی۔ ماتم تو کسی مہینے میں ہو سکتا ہے۔ کل کیوں ہو سکتا ہے۔ آج ہی آ جاؤ۔ ہو سکتا ہے کل آ جائیں اور پوچھو۔ ارے بھائی! سرائے اور دھرم شالہ میں کوئی فرق نظر نہیں آ رہا ہے... گھوڑے اور گدھے میں کیا فرق ہے ـــــ؟ اور پوچھو۔ دو کلو میٹر دور ہے۔ اور پوچھو۔ ہم ضرور بتلائیں گے۔ اجنبی ہونا؟ تبھی!

رات کے دس بجے

نہیں نہیں بھگت۔ ہمیں غصہ نہیں آتا ہے۔ گئی رات اکثر مجبور سیلانی ہمارے دروازے پر دستک دیتے ہیں۔ تشریف لائیے۔ آپ اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں ہیں۔ نام بتائیے۔ یہاں دستخط کر دیجیے۔ ہاں ـــــ ہاں ایک تو کیا آپ دو تین کمرے لے سکتے ہیں۔ پربھو کا گھر، آپ کا گھر ہے نا ـــــ؟ ارے ہاں ماں تو بھگوتی ماں کا روپ ہوتا ہے۔ یہاں دو کمرے لکھیے۔ دو سو روپے دیجیے۔ نہیں۔ نہیں بھگت کرایہ نہیں۔ یہ سیکورٹی ہوتی ہے تاکہ کوئی پنکھا لے کے نہ بھاگ جائے۔ رقم کل واپس لی جا سکتی ہے۔ ویسے آج تک کسی بھگت نے پوری رقم واپس لی نہیں ہے۔ یہ کمرے بھگتوں نے ہی بنائے ہیں۔ دھرم شالہ ہے نا ـــــ؟ بھگت پھاٹک تو بند کر کے جاتے۔ لگتا ہے تمھارے گھر میں دروازے نہیں ہیں۔ ورنہ ـــــ ارے بھائی! مندر کے صحن میں سونے کی اجازت نہیں۔

رات کے بارہ بجے

آ گئے تم —— مَیں جانتا تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔ وہ رہا تمھارا سامان۔ نہیں۔ نہیں مَیں تمھاری خاطر یہاں نہیں رُک گیا ہوں۔ مَیں یہاں رہتا ہوں میرے دوست۔ دفتر کے اس برآمدے میں —— کیوں جگہ اچھی نہیں؟ بھئی کیا کریں۔ گھر تو ملا ہی نہیں۔ تمھیں بھی تو نہیں ملا ہے نا —— ؟ کیسے مِل جاتا۔ سنو دوست، مَیں فرش پر سو جاتا ہوں۔ تم میز پر سو جاؤ۔ مہمان ہو نا؟ تم نے کچھ کھایا۔ کون کھلاتا؟ ہوں، کھانا تو میرے پاس بھی نہیں ہے۔ دارو ہے۔ تھوڑی پی لو۔ ورنہ۔ ورنہ نیند کیسے آئے گی —— نیند نہیں آئے گی تو بچے یاد آئیں گے۔ بچوں کی ماں یاد آئے گی۔ وہ بھوکے ہوں گے۔ وہ یاد آئے گی۔ وہ بیمار ہوں گے وہ یاد آئے گا۔ وہ بلک بلک کر تمھاری یاد میں رو رہے ہوں گے۔ یاد آئے گی۔ اچھا تو تم کنوارے ہو۔ بہت اچھا کیا جو شادی نہیں کی۔ چھوٹے ملازم کو شادی کرنی ہی نہیں چاہیئے۔ پھر تم رو کیوں رہے ہو۔ کس کی یاد آ گئی۔ بوڑھی ماں کی۔ بھائی بہن کی۔ اُف یہ مچھر بھی تو سونے نہیں دیتے۔ یار گھر نہیں تو گھر کی بات نہیں۔ لیکن دوست مچھر تو اپنے گاؤں میں بھی بہت ہے لیکن وہ لڑتا نہیں —— یہاں کا مچھر تیر کمان لے کر حملہ کر دیتا ہے۔ اور کرے گا بھی کیا۔ گھر والے گھر میں گھسنے ہی نہیں دیتے۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ مَیں بہک تو نہیں گیا دوست۔ ایک بات یاد آ گئی۔ میری چھوٹی بیٹی ہے نا، مچھر کو سانپ کہتی ہے۔ یہاں کے مچھر کو دیکھے گی تو مگرمچھ کہے گی۔ ہی ہی۔

سحر کا وقت

تم سوئے نہیں۔ ارے بھئی کہہ دیا نا کہ چوکیدار سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ

اپنے گھر میں رہتا ہے، بیوی بچّوں کے ساتھ۔ اس کی ماں بھی ہے۔ بھائی بھی۔ بہن بھی، اور گھر بھی۔ میرا گھر نہیں ہے نا دوست۔ میں یہاں رہتا ہوں۔ نہیں۔ نہیں۔ فٹ پاتھ پر ان پڑھ لوگ سوتے ہیں۔ میں نے تو اریخ میں ایم۔ اے کیا ہے۔ اس ملک کی تاریخ لکھ رہا ہوں۔ تم کیا کرتے ہو؟ —— حساب کتاب —— ارے! تم خود گر گئے یا کسی نے گرا دیا۔ ارے بھائی کتے پر مت گرو۔ بے چارہ آدم کا بوجھ کیسے اُٹھا سکے گا۔ لو کسایا نا! ہو گئے شروع۔ انقلاب زندہ باد۔ ہماری مانگیں پوری کرو۔ ہم کیا چاہتے ہیں۔ ایک گھر —— تم بھی کچھ کہنا چاہتے ہو، نا۔ کہو۔ پھر کیوں ڈرتے ہو۔ ہی ہی۔ دفعہ کی جگل بندی سے ڈر گئے۔ مگر بھاگ کر جاؤ گے کہاں —— ؟ تمھارا بھی تو گھر نہیں ہے اس بڑے شہر میں۔

صبح آٹھ بجے

دفتر۔

رات بارہ بجے

برآمدہ —— نشے میں چُور چُور —— بے حس و بے حرکت جسم —— مفلوج خیالات —— بے دردی سے کچلے گئے جذبات —— اور ماں، بھائی بہن کے چہرے یاد ہی نہیں —— گھر کا تصوّر ہی نہیں۔

○○

دُوسری کِرن

میں ایک قیدی ہوں۔

تنہا تو نہیں، علیحدہ ضرور ہوں۔

یہ تنگ و تاریک کمرہ زنداں تو نہیں، میرا اپنا گھر ہے۔ گھر میں کتنے ہی کمرے ہیں۔ غالباً ۲۳ ہیں۔

یادداشت کمزور ہے۔ غالباً کھوکھلی ہو چکی ہے۔

مگر ہر کمرہ یکساں ہے۔ وہ جان گیا ہوں۔

نہ کھڑکی نہ دروازہ۔

روشنی ندارد۔ بس ایک چھوٹا سا سوراخ ہے۔ جس کو چیر کر روشنی کی ایک کرن کمرے میں جھانک کر مجھے دیکھتی رہتی ہے۔ اور میں اس کرن کو دیکھتا ہوں۔ اس طرح جیسے

ماضی کو دھکیل کر مستقبل کو دیکھتا ہوں۔ روشنی کی یہ کرن میری اُمیدوں کی دُوسری کرن ہے۔ دُوسری کرن!

پہلی کرن کتنی حسین تھی۔ کتنی دلکش تھی کتنی سہانی تھی۔ غلامی کے اندھیرے کو چیرتی ہوئی وہ چونکا دینے والی روشنی کی کرن!

مَیں نے اس کرن کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ لیکن مجھے یاد ہے اس روز مَیں آزاد ہو گیا تھا۔ غلامی کی زنجیروں سے۔

وہ صبح بھی وہی تھی جیسی آج کی سحر! رنگین، پُرکشش، متاثر کن، لیکن ——
جانے کتنے لمحات بیت گئے۔
کتنے دن۔ کتنی راتیں۔
مہینے۔ سال۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔

شاید تواریخ مجھ سے رُوٹھ کر کہیں چھپ کر بیٹھی ہے۔ اور اگر ایسا ہو بھی تو میں کیا کروں۔ کیا کروں! کیا کروں!! ——؟

آج میرے پاؤں میں بیڑیاں نہیں۔ مگر یہ بیڑیوں کی کھنک کی آواز کیوں سُنائی دے رہی ہے۔ میرا ماضی مجھے آواز دے رہا ہے یا مستقبل للکارنے لگا ہے —— ہوں۔ یہ بھلا مَیں کیسے جانوں —— نا سمجھ ہوں۔ کم بخت میری سمجھ ہی نا سمجھ ہے، میرے آگے آہنی سلاخیں نہیں ہیں اور نہ ہی میرے سر کے اوپر جھُولتا ہوا پھانسی کا پھندہ ہے۔ پھر بھی مَیں کیوں گھبرا رہا ہوں۔ خوف زدہ ہوں۔ مگر کس سے! اپنے آپ سے؟ —— ہا —— ہا —— ہا —— ہا —— !!

مَیں بھاگ نہیں سکتا۔ فرار ہونے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔ کمزور ہوں۔ دوڑ نہیں سکتا۔ اور پھر بھاگ کے جاؤں بھی کہاں —— پانی گہرا نہیں ہے اور تہہ کے اُوپر مچھیرے کا جال ہے۔ مگر۔ مَیں چیخ تو سکتا ہوں لیکن کیسے ——

اُف میری آواز ——— ! یہ کیسے دب گئی ہے ——— یا پھر میں گونگا ہوں۔
ہاں ——— ہاں مَیں گونگا ہوں ——— اور بہرا بھی تبھی تو کروڑوں،
ہوکوں کی آواز مجھے سُنائی نہیں دے رہی ہے۔ مگر کیا وہ واقعی سسک رہے ہیں۔ یہ
ان کی ہچکیوں کی آواز ہے یا میرا وہم یا اپنے ہی خیالات کا عکس ——— یا اپنے
ہی جذبات و خیالات کی گونج !
میری بینائی بہت کمزور ہے۔ مگر آج مجھے اپنے سامنے سب کچھ دکھائی دے رہا ہے
دھندلا دھندلا ——— ! نہیں ——— نہیں ——— صاف صاف ———
سامنے ایک بہت بڑی عمارت کی دیواروں پر ایک تو کیا بہت سارے بورڈ ہیں۔

بڑے بڑے رنگین
موٹے موٹے حروف
اچھی اچھی پُرکشش تصاویر
ایکٹر کی ——— ایکٹرس کی
نیتا کی ——— رہبر کی
مولوی کی سادھو سنت کی
"صحت مند بچوں کے لیے گرائپ واٹر"
"غریبوں کے لیے ہمدردی"
"ٹرین سوٹ پہنیے ——— بالکل امپورٹیڈ کپڑا"
"ماڈل ٹاؤن میں گھر بنائیے"
"مجرم کون"
"رہنما کون"
"حکومت نکمی ہے"

"حکومت کو کوئی خطرہ نہیں۔"

"مرنے والوں کی تعداد فقط ۴۰۰ ہے۔ ۴۱۰ کا دعویٰ غلط۔"

"ملک ترقی کی راہ پر۔"

"فلم دیکھیے۔ لڑائی مار کٹائی سے بھرپور شاہ کار۔"

"سرکس دیکھیے —— جانوروں کے نرالے کرتب۔"

"جوکر —— جوکر —— جوکر۔"

"بھارت کی سیاست میں ایک دھماکہ۔"

"اکثریت ہمارے ساتھ۔"

"ایک انکشاف۔"

"اف! —— اف!!

نہیں۔ یہ سب کیا ہے۔ غالباً میں ہی پاگل ہوں۔

ہاں۔ ہاں۔ میں پاگل ہوں۔

ہا —— ہا —— ہو —— ہو —— ہو۔

مجھے تو ہنسنا چاہیے۔ ایک تماشائی جو ہوں

مجھے رونا چاہیے۔ میرا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔

لیکن ——

یہ کس کے قدموں کی آہٹ ہے۔

یہ کس کی سرگوشیاں سنائی دے رہی ہے۔

—— لو وہ پھر آگیا۔ ہاں۔ ہاں —— پھر آگیا۔

اس نئی کرن کے ساتھ —— دوسری کرن کے ساتھ

مگر آج کون سا دن ہے —— کون سی تاریخ —— کون سا سال

ہاں —— وہی تو ہے۔

جنوری سنہ ۱۹۵۰ء !! سنہ ۱۹۸۵ء یا سنہ ؟؟ء

کیا وہ —— ؟؟ —— !! —— ؟؟

یہ گھڑی مجھے چین سے سانس تک نہیں لینے دے گی

مگر پھر بھی —— چلو —— انتظار —— انتظار —— انتظار !

جوگن

برگد کے اس پیڑ سے مجھے بہت پیار ہے کیونکہ یہ ایک ایسی چھتری ہے جو مجھے بارش اور دھوپ کی شدت سے بچا لیتی ہے - اماں کہتی ہے کہ مہاتما بدھ نے بھی ایک ایسے ہی درخت کے نیچے بیٹھ کر تپسیا کی تھی - پاس کھڑی اس کٹیا میں رہنے والی جوگن بھی جگت کلیان کے لیے برسوں سے تپسیا کر رہی ہے —— یہ سادھو سنت پیر، فقیر اتنی کٹھن تپسیا کیوں کرتے ہیں ؟ میں جب بھی یہاں سے گزر کر سوچتا ہوں تب شاخ پر بیٹھے ہوئے دو پرندے یوں چہچہانے لگتے ہیں گویا کہہ رہے ہوں - نا سمجھ ہو تم میرے قدم رک جاتے ہیں اور میں درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر یا دھوپ میں جھلسے ہوئے پتوں کو دیکھتا رہتا ہوں یا پھر چونچ سے چونچ ملا کر پرندوں کی سرگوشیانہ باتیں سنتا رہتا ہوں - شاید اماں ٹھیک ہی کہہ رہی ہے کہ یہ پرندے شیو اور پاروتی ہیں جو یہاں

چھپ کر اپنے بھگتوں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ لیکن آج یہ دونوں سہمے سہمے کیوں نظر آرہے ہیں۔
شاید وہ بے شکل کا چہرہ اُن کا بھی تعاقب کر رہا ہے۔ وہ بھی لرز رہے ہیں۔ شاخوں میں
بھی لرزش ہے اور وہ بھی دہشت زدہ ہیں۔ دراصل جس سے ہم اس قدر خوف زدہ ہیں وہ
کوئی ایسا جن یا راکشس نہیں جس نے اپنی جان کسی طوطے میں بند کردی ہے بلکہ وہ کسی
انجانے شخص کے ہاتھ میں رکھی گئی ایک جادوئی چھڑی ہے جو کوسوں دور کہیں بٹن دباتے
ہی اڑ کر آگ برساتی ہے۔ اور اگر وہ اڑ کر یہاں پہنچ گئی تو آگ کا ایک دریا بہہ جائے گا۔
سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ برگد کا یہ قدیم پیڑ بھی۔ پرندوں کی یہ سرگوشیانہ باتیں سُن
کر جب میں نے بھاگ جانا چاہا تو میری نظر جوگن پر رُک گئی۔ گلے میں رودرکھش
کی مالا پہنے گیروی رنگ کے وستر پہنے، اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے گویا وہ بھگوان
سے کہہ رہی تھی کہ میری تپسیا مکمل ہو چکی ہے اور اب مجھے نروان نہیں وردھان چاہیئے۔
چاروں طرف تاریکی پھیل گئی اور گویا موت بے قابو ہو گئی۔ اچانک
ایک سنسناہٹ سی ہوئی۔ کوئی پتوں کی سیڑھیوں سے اُتر کر، میرے سامنے سے
گزر کر جوگن کے سامنے جاکر کھڑا ہو گیا۔

پرندے چہچہانے لگے اور جادوئی چھڑی اُڑ کر جوگن کے سامنے رُک گئی۔ پگھلتے
ہوئے لوہے کی مانند سرخ چھڑی کو جوگن کے نرم ہاتھوں میں دیکھ کر میں نے آنکھیں
بند کردیں اور پیڑ کے ساتھ لپٹ کر پرندوں کی باتیں یوں سنتا رہا جیسے دھرت راشٹر
سنجے سے مہابھارت کا آنکھوں دیکھا حال سُن رہا ہو۔

"گرمی کی شدت برداشت نہیں کر پائے گی شاید!"

"نہیں گرفت مضبوط ہے۔ آہنی ارادوں کی طرح ——— مگر کیا وہ
چھڑی کو دور کہیں پھینک دے گی؟"

"نہیں۔ کیا وہ نہیں جانتی کہ صحراؤں میں بھی لوگ رہتے ہیں اور جنگلوں میں

بھی خلا کی مخلوق موجود ہے۔"

"پھر سمندر میں پھینک دینا چاہیے۔"

"نہیں۔ وہاں مگرمچھ سہی، لیکن چھوٹی چھوٹی مچھلیاں بھی تو ہیں۔"

"شاید ہمالیہ کی اُن برفیلی چوٹیوں پر پھینک دے۔"

"نہیں —— وہ مسیحا ہے۔ ایسا نہیں کرے گی۔ تپش سے برف پگھل جائے گی اور سیلاب آجائے گا۔ سب کچھ بہہ جائے گا۔ یہ برگد کا پیڑ بھی۔"

"پھر کیا ہوگا۔"

وہ دونوں خاموش ہوگئے۔ میں سمجھا یہ سمندر کی خاموشی ہے مگر یہ جوگن کا صبر و تحمل تھا۔

چھڑی آگ برسا رہی تھی اور جوگن کے ہاتھ سے نکل کر اُڑ جانا چاہتی تھی۔ آگ برسانا چاہتی تھی۔ مگر جوگن کی گرفت مضبوط تھی۔

اچانک پرندوں نے شور مچایا تو میں نے دیکھا کہ جادوئی چھڑی ٹھنڈی ہو چکی ہے مگر جوگن خود ایک راکھ کا ڈھیر بن گئی ہے۔

صبح ہوئی تو بادل گرج اُٹھے —— پرندے بھی رو پڑے اور آسمان بھی ——

میں نے اپنے ہونٹ سی لیے مگر سارا عالم آنسوؤں کی رَو میں کے ساتھ بہتا ہوا نظر آیا۔

برگد کا پیڑ بچ گیا۔ اور جب ایک کارواں جادوئی چھڑی کو اپنے پاؤں تلے روند کر میرے قریب پہنچ گیا تو پرندے چلّا چلّا کر کہتے رہے۔ جادوئی چھڑی کے ٹکڑے ٹکڑے کردو ورنہ تمہارے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔

میں دُور کھڑا راکھ کا ڈھیر دیکھ کر سوچ رہا ہوں کہ جوگن برگد کے پیڑ کی خاطر قربان ہو گئی ——— بالکل ویسے ہی جیسے حضرت عیسیٰ نے اپنا بلیدان دیا تھا۔

اور پھر

تاریک رات
سکوت کا عالم
اُداس گام
اور وہی جانا پہچانا مقام . . .
ایک ٹوٹے پھوٹے مکان کے اندر
وہ ماں بننے والی ہے
اور وہ باپ!
اچانک کتوں کے بھونکنے کے ساتھ
ایک آہ! ایک تڑپ!! ایک فریاد!!! ———؟

وہ درد سے کراہنے لگی ہے

اور وہ یاس کی آغوش میں آس لگائے

کسی کی آمد کا بے چینی سے انتظار کر رہا ہے

وہ لب سی رہی ہے

اور وہ بے بس ہو کر

ایک کولہو کے بیل کی طرح

اس کے اردگرد چکر لگاتے ہوئے

ملتجی نظروں سے

کبھی اس کے زرد چہرے کو

کبھی اس کے پچکے گال

کبھی سوکھے ہونٹ

اور کبھی

ایک ہڈیوں کے ڈھانچے کو

بار بار دیکھ کر

کچھ سوچ رہا ہے ——— کچھ سمجھ رہا ہے۔

اور پھر ۔ ۔ ۔ ؟

اچانک ——— !!

روشنی کی ایک کرن دیکھ کر

وہ مسکرا رہا ہے

اس کے سامنے گویا

ہاتھ میں مشعل لیے

ایک نئی سحر
صبح کو جنم دے کر
اندھیرے کو مٹانے کی تیاری کر رہی ہے
بجلی! بجلی!! بجلی!!!
خوشی . . . مسرت . . . سکون
ایک اُمید . . . ایک آرزو . . . اور ایک خواب
خواب! خواب!! خواب!!!
دل کش خواب . . .
ایک ماں . . . ایک باپ اور ایک بچہ
زندگی . . . وقت . . . اور مستقبل
دُور دُور تک پھیلے کھیت
اور سرسبز مخملی گھاس پہ
پکھراج کی مانند چمکتے ہوئے
شبنم کے قطرے
آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے
گویا تینوں
ایک ماں! ایک باپ! ایک بچّہ!
زمین، کسان . . . اور خوشحال انسان!!
وہ بے تحاشہ ہنس پڑا . . .
اور پھر . . .
قہقہے . . . قہقہے . . . قہقہے . . .

گویا ڈفلی ہاتھ میں لیے
ایک فاتح فتح کا جشن
منانے کی تیاری کرنے لگا ہو
مگر اچانک ۰۰!۰۰!!۰۰!!!
؟ ؟ ؟
اور پھر ـــــ!ـــــ!ـــــ!
ایک چیخ ـــــ
وہ بال نوچنے لگی ہے
خوابوں کا اونچا مینار
ریت کے ذروں کی طرح
بکھر گیا ہے ـــــ
اور وہ خوف زدہ ہوکر
ویران بستی کو دیکھ رہا ہے
انگاروں سے لپٹی ہوئی ڈسپنسری
خون سے لت پت طبیب
اور مجروح معمار کو دیکھ کر
چیخ پڑا ہے
گویا ایک طوفان
سیلاب یا زلزلے کے بعد
کھنڈرات سے اٹھتی ہوئی دھول
چتاؤں سے اٹھتا ہوا دھواں

دیکھ کر وہ

پانی کی لہروں کا کفن اوڑھ کر
دو گز زمین تلاش کر رہا ہو
یا کسی بیاباں میں
کھُرچ کھُرچ کر
پانی کی دو بوندیں تلاش کر رہا ہو

یا پھر
ٹوٹے پھوٹے مکان کے دریچوں سے جھانک کر
ہر طرف لاشوں کے ڈھیر —— یا
چلتے پھرتے ڈھانچوں کا تعاقب کرتی ہوئی
پولیس کی قطاریں . . . فوج
ہڑتال . . . گھراؤ
بھکے لوگ —— بھٹکے انسان
سوکھے کھیت —— بھوکا آدم
اور سسکتی ہوئی ننگی حوّا
دیکھ رہا ہو

یا پھر
آنکھیں بند کر کے
کسی خندق میں بیٹھ کر
نعروں کی گونج —— گولیوں کی آواز
بادلوں کی گرج ٹینکوں کا شور

اور طیاروں کی گڑگڑاہٹ
سن رہا رات بھر۔۔۔
اور پھر ــــــ
نئی سحر! صبح!
نئی صبح ــــــ مگر!۔۔۔؟
اس کی ہچکیاں بند ہو چکی ہیں
اس کے آنسوؤں کا تالاب بھی
سوکھ چکا ہے۔
اور وہ
ایک شکست خوردہ سپاہی کی طرح
نظریں جھکائے
اپنی بیوی کے بے حرکت و ٹھنڈے جسم
کو دیکھ کر۔ اس
ملبے کے نیچے دبے اپنے بچے کو دیکھ رہا ہے
اور پھر ــــــ
اپنے تھرتھراتے ہونٹوں کو
بجتے ہوئے دانتوں سے پکڑ کر
نظریں اٹھا کر
آنکھوں میں تپش محسوس کرتے ہوئے
افق میں شفق کی
لالی دیکھتا رہا ــــــ!

اور پھر ـــــــ

اندھیرا ـــــ اندھیرا ـــــ

سکوت کا عالم

وہی گام

ویسی ہی شام

وہی مقام

ایک ٹوٹا پھوٹا مکان

یا ایک کھنڈر

بیسویں صدی کا کیپسول

یا پھر اگلی صدی کے مآخذ

کھنڈرات ـــــ کھنڈرات ـــــ کھنڈرات!

اور پھر

گھڑی کی ٹِک . . . ٹِک . . . ٹک . . .

آدم کی آہ وزاریاں

بیسویں صدی کا مرثیہ!

OO

پوسٹر

عدالت کا فیصلہ سنتے ہی دونوں کے راستے الگ الگ ہو گئے۔
ایک فوٹو کے دو ٹکڑوں کی طرح۔

دونوں کا جوڑا ایک قابلِ رشک و مثالی جوڑا تھا۔ گویا کینوس پر دو رنگوں کی بہترین ترتیب۔

یہ دلکش و مشہور تصویر دونوں کے خوابوں کی تعبیر تھی۔ مگر آج؟!!

دونوں کی شادی جب اسی عدالت میں رجسٹرڈ ہوئی تھی تب میں ایک قانونی گواہ تھا اور آج بھی میں ہی ایک ایسا چشمِ دید گواہ ہوں جو اپنی پلکوں سے آنسوؤں کی ممانعت کو روک کر مایا کو دیکھ رہا ہے۔

مایا کے قدم اس طرف جا رہے ہیں جہاں مسافروں سے کھچا کھچ بھری بس

کھڑی ہے۔ اور کارتک کمار سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لگاتا ہوا اس طرف جا رہا ہے جہاں اس نے کار پارک کی ہے۔ ڈرائیور بار بار ہارن بجا رہا ہے اور بس میں بیٹھی سواریاں مایا کو یوں دیکھ رہی ہیں جیسے ایک خوبصورت سی لڑکی رسّی پر چلتی ہوئی اپنا توازن قایم رکھتے ہوئے ان کے قریب پہنچنے کی کوشش کر رہی ہو۔

مایا کو ہر ایک نگاہ گھور گھور کر دیکھ رہی ہے وہ ایک تماشا ہے اور میں شاید واحد فکر مند تماشائی۔

میری نگاہیں کارتک کمار کا بھی لگاتار تعاقب کر رہی ہیں۔ میں دونوں کا مشترکہ دوست جو ہوں۔

دونوں میری عزّت کرتے ہیں۔ مگر آج۔؟۔!!

مایا مشکوک نظروں سے مجھے دیکھ کر یوں ڈگمگا رہی ہے گویا رسّی پر چلتے چلتے وہ اپنا توازن کھو بیٹھی ہو۔ شاید وہ گر جائے گی۔ مگر نہیں۔ اس نے اپنے آپ کو مشکل سنبھالا ہے۔ میں نے دوڑ کر سرگوشیانہ انداز میں پوچھا۔

"مایا یہ تم نے کیا کیا؟ ایک سنگیت کار اور گلو کار کا ملن تو غیر فانی ہے۔ پھر یہ طلاق ـــــــ؟"

مایا نے اپنی نظریں شرم سے جھکا کر جب اُٹھائیں تو اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے ایک سوئی ہوئی شیرنی کو پتھر مار کر جگا دیا ہو۔

ایک پھول کی طرح نازک شرمیلی عورت کا جسم یوں لرزنے لگا جیسے ایک شرابی کے ہاتھ میں خالی جام۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا تو نیلی نیلی آنکھوں کے ارد گرد لالی پھیلتی جا رہی تھی۔ حیا بے حیائی سے لڑ رہی تھی یا پھر بے وفائی وفا کو دبوچ گردن کا فوارہ دیکھ رہی تھی۔ وہ خاموش تھی مگر اس کے ہونٹ دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا تھا،

جیسے ہونٹ زبان پر آئے ہوئے الفاظ کو دبانے کی کوشش کر رہے ہوں یا پھر الفاظ ہی بند ہونٹوں کو اڑا کر لاوے کی طرح پھٹ کر باہر آنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

اتنا غصّہ! اتنی نفرت!!۔ مگر کیوں؟۔!!!

لرزش سے اس کا آنچل بے قابو ہو کر جب کندھے سے پھسل کر گر گیا تب اُس کے مرمریں سینے کا اُبھار یوں تھرتھرا رہا تھا جیسے سہاگ رات کو پہلی بار مرد کے سانسوں کی گرمی محسوس کرتے ہوئے ایک دُلہن کے تشنہ لب ہونٹ تھرتھرا رہے ہوں۔

ڈرائیور نے ہارن بجایا۔ اور مایا اپنی عجیب و غریب کیفیت پر قابو پا کر فوراً بس کی طرف جانے لگی ہے۔

بس میں بیٹھے مُسافر مایا کو دیکھ کر اطمینان کا سانس لے رہے ہیں گویا ندی پر چلتی ہوئی لڑکی دوسرے کنارے پر پہنچ چکی تھی۔ اور تماشہ ختم۔

مگر میں یوں محسوس کر رہا ہوں جیسے ایک ہرنی جنگل کی طرف دوڑتی جا رہی ہو کسی نئے ہرن کی تلاش میں۔

مگر کیسا ہرن؟؟

مجھ جیسا ایک بدصورت شاعر ——— یا کارتک کمار جیسا خوب رُو موسیقار؟؟

کارتک کمار تو خوبیوں کا ایک مجسّمہ ہے۔ آخر کس چیز کی کمی ہے اس میں! اور اگر نہیں ہے تب یہ طلاق کیوں!! سگریٹ کا ایک لمبا کش لے کر وہ سگریٹ کی راکھ نہایت بارعب طریقے سے جھاڑ کر کارتک کمار نے اپنی خوبصورتی سے تراشی ہوئی بڑی بڑی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے میرے سوال کا جواب دیا۔

"یار روز روز کے لڑائی جھگڑے تو قابلِ برداشت ہیں، وقتاً فوقتاً کی

کی ہاتھا پائی بھی قبول کی جا سکتی ہے۔ طعنہ بازی بھی سہی جا سکتی ہے مگر مایا! اُف!!
یہ عورت ہر رات میرے بال نوچتی تھی۔ میرے جسم کو اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے کھرچتی
تھی۔ ایک پاگل کی طرح۔ ایک خونخوار وحشی درندے کی طرح۔ بھوکی عورت!"

وہ شاید کچھ اور بھی کہتا۔ مگر گاڑی کا سیلف پھنس گیا تھا اور وہ کچھ کہنے
کے بجائے بار بار چابی گھما کر چابی کو دیکھتا رہا! مایا جا چکی تھی۔

اور میں کارتک کمار کی مونچھوں کو دیکھتا رہا جو ٹرک کے کنارے لگے ہوئے
مردانہ وجاہت کو عیاں کرنے والے رنگین پوسٹر کی طرح بے حد حسین ہیں۔
مگر بے حس و حرکت۔

موت اور زندگی

خط کی آخری سطر لکھ کر اس نے اپنی آخری تحریر پڑھ لی مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنے دستخط کرتے ہی طے شدہ پروگرام کے تحت میز پر رکھا ہوا گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر دیتا، گلاس فرش پر گر گیا۔ اور ایک زبردست جھٹکے نے ساری عمارت کو ایک کھلونے کی طرح ہلا کر رکھ دیا۔

گلاس میں ڈالا ہوا زہر قالین کے ریشوں میں جذب ہو گیا اور وہ موت کے بالکل قریب جا کر بھی موت کے آغوش میں نہ سو سکا۔

روشن کی عمر ہی کیا ہے جو اس کی زندگی کا دیا ٹمٹمانے لگتا۔ ۲۰ سال کا یہ خوبرو ناکام عاشق اپنی زندگی کا دیا خود ہی بجھانا چاہتا ہے۔ شاید جذبات نے اس کے ارد گرد ایسی دھند پھیلا دی ہے کہ اسے کوئی دوسرا راستہ نظر ہی نہیں

آیا ہے۔ جہاں سے وہ گزر رہا ہے وہاں اسے زندگی ایک ریگستان نظر آرہی ہے۔ ذرّوں کی طرح بکھری ہوئی۔ پیاسے پریمی کو محبت ایک سراب کی مانند نظر آرہا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ گھٹ گھٹ کر پانی کی دو بوندوں کے لیے ترس ترس کر مرجانے سے پہلے اپنا سفر وہاں ہی ختم کرنا چاہا ہے۔ جہاں اس کی محبوبہ اس کو صحرائے عظیم میں تنہا چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ کسی تیز رفتار اونٹ سوار کے ساتھ۔ اس کی دیوانگی کی ہنسی اُڑاتی ہوئی۔

دیوانے کو دیوانگی منظور نہیں تھی۔ خواب جب ریت کے ذرّوں کی طرح بکھر گئے تو ذرہ ذرہ سمیٹنے کے بجائے اس نے اپنے وجود کو ان ذرّوں کے نیچے دفن کرنا ہی بہتر سمجھا۔ اُدھر معشوق کی ڈولی اُٹھی اور اِدھر ایک دل شکستہ عاشق اپنی تڑپتی رُوح کو قفس سے آزاد کرنے کے منصوبے بناتا رہا۔

سوچ کی انتہا حیرت ہے مگر وہ اپنے ارادے سے نہ تو حیران تھا اور نہ ہی پریشان۔ پھر اس کے یہ ارادے اسے خوفزدہ کر کے راستہ بدلنے کے لیے کیونکر اکساتے اس کے ارادے مصمّم تھے۔

ایک کوشش ناکام ہوئی تو خودکشی کی بہت ساری ترکیبیں اس کے ذہن میں اُبھرنے لگیں۔

پنکھا اور پھانسی کا پھندہ۔ بجلی کی ننگی تار۔ یا پھر کمرے یعنی ہوٹل کی ساتویں منزل سے کود کر جان دے دوں!

وہ کولہو کے بیل کی طرح کمرے کے اندر چکر لگاتا رہا اور بار بار اپنی تحریر پڑھتا رہا۔

"میں اپنے آپ سے گھبرا کر اپنے آپ سے دور ہونا چاہتا ہوں۔ زندگی کا دامن چھوڑ کر موت کی چادر اوڑھ کر۔"

آخر جب جذبات، خیالات، احساسات ایک ہی شکل اختیار کر کے اس کے معصوم ارادے کے بھاری بوجھ کے نیچے دب گئے تو اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ کھڑکی کھول دی مگر اس جھٹکے کے ساتھ ساری عمارت کو بھی ایک زبردست جھٹکا لگ گیا۔ در و دیواریں ہلنے لگے جیسے کسی مرگی کے مریض کو دورے پڑ رہے ہوں۔

اچانک بجلی بند ہو گئی اور چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ رات کے دو بجے غیر فطری طور پر پرندوں نے زبردست شور مچانا شروع کیا۔ کتے یوں بھونکنے لگے گویا ایک بوڑھا باپ جوان بیٹے کی لاش دیکھ کر نوحہ خوانی کر رہا ہو۔ اور پھر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔

"بچاؤ۔ بچاؤ۔!" آس پاس زبردست بدحواسی پھیل گئی۔

"بھاگو! بھاگو!!" ہر طرف آوازیں یوں گونجنے لگیں گویا سائرن بج رہا ہو۔

"جاگو۔ جاگو۔ سونے والو جاگو!!"

"زلزلہ! زلزلہ!!"

"مر گئے۔ مر گئے۔ ارے کوئی بچاؤ۔"

"یا خدا یہ کیسا قہر!"

"دیواریں گرنے لگی ہیں۔ باہر نکلو!"

"ماں تم کہاں ہو؟"

"بیٹے!"

"ایک اور جھٹکا لگا ہے۔"

"زندگی پیاری ہے تو دوڑ لگاؤ۔"

"اور تیز۔ کھلا میدان فقط ایک کلومیٹر دور ہے۔"

"اندھیرے میں مجھے کچھ بھی نہیں دکھائی دے رہا ہے۔"

"تو اسکول کی بلڈنگ بھی گر گئی شاید۔"

"لگتا ہے ان دیکھی بمباری ہو رہی ہے۔"

"بارود نہیں۔ زمین پھٹ رہی ہے۔"

ایسا زلزلہ اس علاقہ میں پہلے کبھی بھی نہیں آیا تھا اپنے بچاؤ کی خاطر بہت ہی تیز رفتار سے دوڑنے والے مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے، یہاں تک کہ مریض گرتے سنبھلتے ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے یا تو صدائیں، آہ و زاریاں، چیخ و پکار سنتے رہے یا پھر موت کے قدموں کی آہٹ جو بار بار یوں سنائی دے رہی تھی جیسے گنبد کی گونج۔ نہایت ڈراؤنی!

زلزلے نے علاقے کو یوں تباہ و برباد کر دیا تھا جیسے بچوں کے بنائے گھروندوں کو کسی ظالم نے ٹھوکریں مار مار کر مسمار کر دیا ہو۔ مکان ملبے کے ڈھیر بن گئے تھے۔ اور لاشیں ملبے کے نیچے دب کر اپنا مرثیہ خود پڑھتے ہوئے نظر آ رہی تھیں۔ مگر کچھ لوگ جو شور و غل کی آواز سنتے ہی فوراً اپنی جان بچانے کی خاطر جوں توں ایک کھلے میدان میں پہنچ گئے تھے۔ وہ سب بچ گئے تھے۔

بچنے والوں میں خوش نصیبوں میں روشن بھی تھا!

GOVT. COLLEGE FOR WOMEN
TEXT BOOK LIBRARY
Acc. No 13575
Date
SRINAGAR

مَیں کون؟!

(الف)

ابھی بہت سویرا ہے
کھڑکی آدھی کھلی ہے
اور مَیں،
تھکا ہارا
بستر پر دراز
سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لگا کر،
دھوئیں کی پتلی پتلی لکیریں
دیکھ رہا ہوں
باہر برف گر رہی ہے

ہلکی ہلکی، خموش خموش
گویا ان پہاڑوں کے پیچھے
"آشا"
نراش ہو کر
غمِ فرقت میں
چپکے چپکے
آنسو بہا رہی ہے!
ہر طرف برف ہی برف ہے۔
اور میں
جذبات و احساسات کی
گھٹن محسوس کرتے ہوئے
برف کی چادر پر
چند قدموں کے نشان دیکھ کر
جانے کب سے
برف کے تودوں کے نیچے
اس پری وش کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں
جس کی سرگوشیاں
ایک مدت سے
ان دیواروں سے ٹکرا کر
بار بار
بادِ صرصر کے پر لگا کر

اُڑ جاتی ہیں
دُور —— بہت دُور

(د ب)

برف سے ڈھکی ہوئی چوٹی پر جا کر
میں زور زور سے چلاتا ہوں
"میں، اگر میں، نہیں —— تو پھر، میں،
کون ہوں؟
"تم اگر تم نہیں —— تو پھر
کون ہو؟
یہ سرگوشیاں اگر میرا وہم ہیں
تو پھر،
وہ صدائیں کس کی تھیں؟
یہ قدموں کی آہٹ
اگر تمھارا قرب ہے۔ تو پھر،
برف پر یہ نشان کس کے ہیں؟
میں چلاتا رہا —— چلاتا رہا۔
جنگلوں میں۔ بیابانوں میں،
مندروں میں، گرجوں میں،
مسجدوں میں، گُردواروں میں،
اور یوں صدیاں بیت گئیں
لیکن آج —— چاند ستاروں سے نظریں ہٹا کر

شعلوں سے لپٹی ہوئی چِتا کو دیکھ کر
برف کی تہوں کو پگھلتے ہوئے دیکھ کر
میں نے پوچھا —— تمھیں جواب دینا ہی پڑے گا
'میں' اگر 'میں' ہوں تو پھر 'تم' کون تھے
'تم' اگر 'تم' تھے پھر میں کون تھا۔
"آشا" —— ایک آواز گونج اُٹھی
نراشا —— یہی آواز پھر سنائی دی
اور میں آواز کے پیچھے دوڑتا رہا
ایک جوان کی طرح ہانپتے ہوئے
ایک بوڑھے کی طرح کانپتے ہوئے
میں صدائیں دیتا رہا
ایک کھوئے ہوئے بیٹے کی طرح
ایک گم شدہ باپ کی طرح
تب ایک آواز نے مجھے چونکا دیا
رُک جاؤ —— دیکھو —— اور پھر چلے جاؤ۔
کون ہو تم ؟ ——
مٹی ! —— پانی !! —— ہوا !!!
(دھرتی)
ہا - ہا - ہا - کیوں کُرید رہے ہو راکھ کے ڈھیر کو
کیوں ہٹا رہے ہو برف کے تودوں کو
کیوں کاٹ رہے ہو ان چٹانوں کو

آوازیں گونجتی رہیں
اور تیز ہوائیں چلتی رہیں
کہاں ہو تم؟ ——— مَیں چلّاتا رہا
مَیں یہاں ہوں، خلاؤں میں کیوں گھورتے ہو
مَیں پہاڑوں کے پیچھے بھی نہیں ہوں۔
ذرا پلٹ کر دیکھو
مَیں یہاں ہوں
تمھارے پیچھے!
ہا۔ ہا۔ ہا۔ ڈر گئے۔ اپنا عکس دیکھ کر
اپنی صورت دیکھ کر!
اپنا وجود دیکھ کر۔
ہا۔ ہا۔ ہا۔ ڈر گئے؟!
ہڈیوں کا ڈھانچہ دیکھ کر!
ہا۔ ہا۔ ڈر گئے؟!
راکھ کا ڈھیر دیکھ کر!!
مَیں، آنکھیں بند کر کے
سُن رہا ہوں!
اور بادِ صرصر کی آواز
مگر مَیں کون تھا ———!!

○○

وہ عورت

اُس عورت کو کون نہیں جانتا جتنی خوبصورت ہے اتنی بدنام بھی۔ مگر اپنی سحر انگیز مسکراہٹ سے دل لوٹنے والی یہ عورت کیا جادو ٹونا بھی کرتی ہے؟ اگر ایسا نہیں تب وہ ہر روز صبح سویرے مذبح خانے پر کیوں جاتی ہے؟ یہ سوال تمام شہر کے لیے ایک معمّہ بن چکا ہے۔ مگر اس سے کوئی پوچھے بھی تو کیسے۔ وہ ایک طوائف ہے!

مَیں بھی کئی دن سے اس کا پیچھا کرتا رہا ہوں۔ روز صبح سویرے مذبح خانے کے پھاٹک کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے اور خاموشی سے اندر جاتے ہوئے بھیڑ بکریوں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی ہے۔ خون سے لت پت کھالیں دیکھتی ہے اور نالی سے بہتا ہوا خون دیکھ کر اپنے ہونٹ چلاتی ہے۔ آنکھیں بند کر کے جانے سرگوشیانہ انداز میں کچھ

منتر پڑھتی ہے یا کچھ کہتی ہے اس کی خود کلامی کوئی سُننے بھی تو کیسے۔ وہ بری عورت جو ہے۔ اور جو کسی نے جرأت کر کے پوچھا بھی تو وہ ہنس کر یا غصّے سے ٹال دیتی ہے۔ یہ سوال پوچھتے پوچھتے یہ عورت میری دوست بن گئی ہے۔ مگر وہ میرے سوال کو بھی ٹال دیتی ہے۔ رات بھر آج بھی باتیں ہوئیں مگر میں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔

طلوعِ سحر کے ساتھ آج جب میں نے قدموں کی آہٹ سُنی تو میں ایک گیند کی طرح اچھل کر اُس کے سامنے کھڑا ہو اور کاوٹ بن کر۔ اس نے مجھے ڈھکیلنے کی بھی کوشش کی۔ مگر میں نے اسے ٹوکا اور روکنے میں کامیاب ہوا۔ وہ خاموشی سے میرا چہرہ دیکھتی رہی۔ ٹکٹکی لگا کر۔ جب اس کی بے شرم نگاہیں جھک گئیں تو میں نے ایک پولیس افسر کی طرح نہیں بلکہ ظاہری ہمدردی کا سہارا لے کر اُس سے پھر وہی سوال پوچھا۔ اور اس بار اس کے تھرتھراتے ہونٹ یوں پھٹ گئے، جیسے کالے بادل برس پڑے ہوں۔ وہ چیخ کر رو پڑی۔ اور سارا دن روتی رہی۔ میں بھی اس کے سیلاب کو روک نہیں سکا۔ اس سوکھی ندی میں سیلاب کہاں سے آیا۔ کیا یہ جادو کی کرامت ہے۔ شام ہوئی تو اس نے نہ بال سنوارے اور نہ ہی گالوں پر میک اپ کی تہہ چڑھائی۔ اور ایک اُجڑے گلشن کی طرح میرے سامنے بیٹھی رہی۔ اپنے گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھ کر ——— اس عورت سے لپٹ جانے کی آرزو تو مجھے تھی نہیں مگر آج اُس نے بھی مجھ سے لپٹنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ جسم بیچنا نہیں چاہتی تھی اور میں بھی خریدار نہیں تھا۔ نتیجہ جمود تھا۔ لیکن میں نے جمود توڑ ڈالا۔ اور وہ آخر بول پڑی۔ غالباً میں اس کی دُکھتی رگ کو پکڑنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ تبھی وہ ایک باغی کی طرح سر اُٹھانے کی بجائے آنکھیں جھکا کر آہستہ آہستہ رُک رُک کر کہتی رہی۔ اس کی آواز میں کانچ کے ٹوٹنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"وہاں نہیں جاؤں گی تو دھندا کیسے کروں گی۔ اس روز بھلا کیا مجھے معلوم تھا کہ میں کسی محفوظ جگہ کی بجائے مذبح خانے کے احاطے میں داخل ہو چکی ہوں۔ سوچا

تھا مچھلی مچھیرے کی گرفت سے پھسل کر پانی میں جا چکی ہے۔ مگر بچاؤ کرنے والا پانی گہرا نہیں تھا۔ میں سہمی سہمی دیوار کے ساتھ چمٹ کر بیٹھی رہی۔ رات بھر اچانک مجھے سرگوشیوں کی آواز نے یوں چونکا دیا جیسے کالی کوٹھری کا دروازہ کھولنے کے لیے پیش قدمی کر رہے ہوں۔ سحر کی دھندلی روشنی میں جھانک کر دیکھا تو ایک شخص ایک بھیڑ کو بڑے پیار سے تھپکیاں دے دے کر گھاس کھلانے کی کوشش کرتے ہوئے اسے احاطہ میں لا رہا تھا۔ بہت پیاری بھیڑ تھی۔ بالکل ہمارے بھیڑ کی مانند سفید سفید۔ مجھے بھیڑ کی یاد آ گئی۔ جو بک چلی تھی۔ پھر وہ وسیع میدان یاد آیا جہاں ہم دونوں گھومتے پھرتے تھے۔ گاؤں بھی یاد آیا۔ برف پوش پہاڑوں سے ڈھکا ہوا۔ دیودار کے اونچے اونچے درخت یاد آئے۔ دیواروں کے آغوش میں اپنا گھر یاد آیا۔ ماں یاد آئی۔ باپو یاد آئے اور میں چیخ پڑی تو قصائی نے بھیڑ کا سر آہستہ آہستہ دھڑ سے الگ کر دیا تھا۔ یہ بھی ماں باپ سے الگ ہو چکی تھی۔ خون کا ایک فوارہ نکل گیا اور آس پاس کھڑے قصائی اپنی اپنی باری کا انتظار کرتے رہے۔ خون آلودہ کھال دور پھینک دی گئی اور کھونٹی پر لٹکانے کے لیے بھیڑ پر ایک مہر لگ گئی۔ قصائی گوشت کو سائیکل پر لاد کر لے گیا بیچنے کے لئے میرا بھی خون نکلا تھا اور میں بھاگ گئی تھی۔ بیچاری بھیڑ۔ میں سوچتی رہی۔ دل نے چاہا کہ سامنے رکھی ہوئی بھیڑ کی رسّی کھول دوں۔ مگر ایک مضبوط ہاتھ نے میرا منہ بند کیا اور میں خود اس بھیڑ کی طرح مہ مہ کرتی رہی اور پھر خاموش ہو گئی۔ کالو مجھے سائیکل پر تو نہیں کندھے پر اٹھا کر لے گیا۔ مجھ پر بھی فروخت منڈی کی مہر جو لگی تھی۔ دوسرے دن جب کالو میرا دوسرا گاہک لایا تو میں ایک نرم دل والی ۱۵ سال کی لڑکی نہیں تھی بلکہ ایک سخت دل والی ۱۵ سال کی عورت تھی۔ میری بھیڑ کی تو گردن کٹ گئی ہوگی۔ میرا تو بس دامن تار تار ہو کر لہولہان ہو چکا تھا۔ تبھی تو دس سال سے ظلم ہوتے ہوئے دیکھ کر ظلم برداشت کرتی آئی ہوں ورنہ ——— " وہ

اچانک خاموش ہوگئی۔

چند لمحات کے بعد جب اُس کے ہونٹ ہلنے لگے تو مجھے یوں لگا جیسے ذبح ہوتی ہوئی بھیڑ اپنی دُم ہلا رہی ہو۔

"خدا جانے میرے پیارے بابو ٹھیک ہو بھی گئے تھے یا نہیں۔ دق کے مریض تھے نا!"

یہ کہہ کر وہ ایک بچے کی طرح بلک بلک کر رونے لگی اور شاید میرے جانے کے بعد بھی روتی رہی۔

دُشمن

عف عف کی آواز جب تکرار اختیار کر گئی تو اس کے قدم رُک گئے۔ وہ وقت کا طاقتور ترین انسان ہے۔ ایک ایسا شخص جو دنیا کے کسی کونے میں فقط ایک انگلی اُٹھا کر یا ہونٹ ہلا کر ساری کائنات کو ہلا سکتا ہے جس کے قدموں کی آہٹ سے زمین کانپ جاتی ہے۔ پہاڑ تھرتھراتے ہیں اور دریا اپنا بہاؤ بدلنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔

وہ ایک ایسا شخص ہے جس کے بڑھتے ہوئے قدم ٹینک نہیں روک سکتے۔ کیونکہ اس کے پاس طیارے ہیں۔ اس کو جنگی طیارے خوفزدہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اس کے پاس طیارہ شکن میزائلز ہیں۔ اس کے پاس طرح طرح کے بم ہیں۔ آگ برسانے والے، زہریلی گیس پھیلانے والے۔ ایٹم بم، ہائیڈروجن بم، کوبالٹ بم۔ اور اتنی بڑی

طاقت کے سامنے ایک کتے کی کیا حیثیت ؟ یہ سوچ کر وہ مسکرانے لگا۔ قہقہے لگانے لگا ——

لیکن اچانک کتے کے بڑھتے ہوئے قدم، نوکیلے دانت، قہر آلود نگاہیں، دیکھ کر اس کے قدم پیچھے ہٹتے گئے۔ پہلے آہستہ آہستہ اور پھر تیزی سے —— بے بس ہو کر وہ ہانپنے لگا۔ کانپنے لگا اور دوڑتے دوڑتے اپنے بچاؤ کی خاطر جھاڑیوں کے پیچھے، کھوکھلے درختوں کے اوپر چھپتا رہا۔ مگر کتا ایک آسیب کی طرح اس کا پیچھا کرتا رہا۔ دوڑتے دوڑتے اُسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے کتے کی رفتار میزائیل سے بھی زیادہ تیز ہے۔ کتے کی بھوں بھوں کی آواز بم کے دھماکوں اور توپوں کی گڑگڑاہٹ سے بھی زیادہ بھیانک ہے۔ موت اس کا پیچھا کرتی رہی اور وہ بھاگتا رہا۔

اچانک کتا خاموش ہو گیا۔ ایک نوکیلے پتھر نے ایک ہی وار میں کتے کا کام تمام کر دیا تھا اور ایک انسان خون سے لت پت کتے کو دیکھ کر قہقہے مارتا ہُوا سامنے سے گزر کر ایک غار میں گھس گیا۔

اپنے تیز سانسوں پر قابو پاتے ہوئے اس نے جب غار میں جھانک کر دیکھا تو صدیوں پرانا انسان اُسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ غالباً اس لیے کہ اس کے دشمن وحشی درندے تھے۔ انسان نہیں! —— اور اُس کے پاس اپنی حفاظت کے لیے نوکیلے پتھر تھے۔ بم نہیں۔!!

ڈرپوک

آج پھر ممی اور ڈیڈی میں جھگڑا ہوا - واہ! واہ! مزہ آگیا - آج میں اپنے کمرے میں اکیلا نہیں سوؤں گا - ممی بھی میرے ساتھ سوئے گی - تبھی تو مزہ آئے گا۔ مگر یہ ممی ڈیڈی سے کیوں لڑتی رہتی ہے - اُف میرا تو سر پھٹ گیا ——— یہ ڈیڈی بھی تو اچھے نہیں ہیں - خوب مارتے ہیں ممی کو - وہ کوئی ہیڈ ماسٹر نہیں - ؟ کیوں مارتے ہیں ——— ہاں ——— ہاں - سمجھا - ممی نے کام نہیں کیا ہو گا - مگر ممی تو اسکول جاتی ہی نہیں - پھر ناخن نہیں کاٹے ہوں گے - اس لیے مگر نہیں - نہیں ——— ممی کے ناخن کتنے پیارے پیارے ہیں - لال لال - ممی کے گال بھی تو لال ہیں، ہونٹ بھی - ہائے میری ممی کتنی اچھی ہے - بہت اچھی ہے - مگر مجھے اپنے ساتھ کیوں نہیں سونے دیتی - بُری ہے ——— نہیں ——— اچھی

ہے۔ آج سُلائے گی نا۔ ڈیڈی کے ساتھ جھگڑا جو ہوگیا ہے۔ واہ۔ واہ۔ تبھی تو مزہ آئے گا۔ ممی ڈیڈی روز روز لڑتے رہیں تو بہت اچھا ہے۔ مگر ٹیچر کہتی ہے جو لڑتے ہیں جھگڑتے ہیں وہ گندے ہوتے ہیں۔ میرے ممّی ڈیڈی بھی گندے ہیں؟ اُف ——! میرے دوستوں کو پتہ چلا تو ——! ہوں کیسے پتہ چلے گا۔ مَیں ان کو بتاؤں گا ہی نہیں۔ جھوٹ! بولوں گا۔ نہیں، نہیں۔ کوّا نہیں کاٹے گا۔ مَیں چپ ہو جاؤں گا۔ مگر! مگر! یہ پپّو بڑا چغل خور ہے۔ ہا۔ ہی ہی۔ وہ بھی کیسے بتائے گا۔ بیمار ہے۔ ہاں روتا رہتا ہے۔ روتا رہے، وہ بیمار ہی رہے تو اچھا ہے —— اگر سونو نے کہا تو۔ وہ کیسے کہے گا۔! وہ انگوٹھا چوستا رہتا ہے تبھی تو وہ بول نہیں سکتا۔ چھوٹا ہے نا —— بہت چھوٹا —— ممی کہتی ہے مَیں بڑا ہو گیا ہوں۔ دیکھو تو کتنا بڑا ہو گیا ہوں —— ارے ماں! اتنا بڑا —— مگر مجھے۔ پھر ڈر کیوں لگتا ہے۔ نہیں نہیں۔ مَیں ڈرپوک نہیں ہوں۔ ممّی کہتی ہے مَیں بہادر ہوں۔ دوسری جماعت میں پڑھتا ہوں نا۔ مگر وہ کالا کتا —— اری ماں! جب وہ بھونکتا ہے تو کمرے میں اندھیرا کیوں ہو جاتا ہے۔ یہ بجلی کون بند کر دیتا ہے۔ ہوں۔ آج جب وہ وف وف کرے گا، اوں اوں کرے گا تب مَیں اس پر پتھر مار دوں گا۔ پتھر کہاں سے لاؤں؟ مَیں نے تو وہ باہر پھینک دیا ہے۔ تب کیا ہوا —— آج ممی جو میرے ساتھ ہے۔ کتّا مجھے سمجھتا کیا ہے۔ ڈرپوک! مَیں کسی سے بھی نہیں ڈرتا —— کیوں ڈروں؟ مگر وہ ڈائن —— اوئی۔ اوئی۔ ما۔ ماں —— ؟ وہ ڈائن رات بھر چھت سے جھانک جھانک کر کیوں دیکھتی ہے مجھے۔ وہ مجھے مار ڈالنا چاہتی ہے نا —— مگر کیوں —— ہوں۔ آج جب وہ آئے گی تب مَیں اس کی آنکھیں نکال دوں گا۔ آ—— ہا ہا —— ہو۔ ہو۔ ہو —— اندھی ہو جائے گی۔ بہت بری ہے لاتے کو میرا لحاف اُٹھا کر فرش پر گرا دیتی ہے۔ مَیں سردی سے ٹھٹھر جاتا ہوں اور

خود بھاگ جاتی ہے۔ یہ ڈاین وہی ڈاین ہوگی جو بچے پکڑ کر لے جاتی ہے۔ تھیلے میں ڈال کر۔ اوری ماں —— مگر یہ ڈاین کمرے میں کیسے داخل ہو جاتی ہے۔ اُدھر سے یہ شیشہ بھی اسی نے توڑا ہوگا۔ مگر آج ذرا آنے دو اسے۔ میں اسے پکڑ کر رسی سے باندھ دوں گا —— اور پھر میں —— میں کیوں ممی بھی تو مارے گی اُسے —— نانی یاد آئے گی —— اف —— مجھے نانی ماں کی کیوں یاد آتی ہے —— مرگئی —— اس سے یہ ڈائن ڈرتی تھی۔ تب نہیں آتی تھی —— ممی سے بھی تو ڈرتی ہوگی یہ ڈائن۔ مگر وہ دوسرے کمرے میں سو جاتی ہے۔ مگر آج تو میرے ساتھ سوئے گی۔ ڈیڈی کے ساتھ کٹی جو ہو گئی ہے۔ آج ہم ڈاین کو مُرغا بنا دیں گے۔

واہ واہ —— بڑا مزا آئے گا —— ہا۔ ہو۔ ہو۔ ہو۔

واہ —— آج تو مزہ آرہا ہے۔ ممی کی لحاف کتنی گرم ہے۔ ممی کوئی ربڑ کی بوتل تھوڑی ہی ہے جو ٹھنڈی ہو جائے گی۔ ارے واہ ممی کتنی گرم ہے۔ ہوں۔ برف گرتی ہے مجھے کیا —— آج سے تو ممی میرے ساتھ سوئے گی۔ یوں چمٹ کر —— ممی کیا میری اپنی ممی نہیں ہے —— ہے —— ہے —— وہ ببلو جھوٹ بولتا ہے۔ میری ممی مجھے چھوڑ کر کہیں بھی نہیں جائے گی۔ میں ممی کو کہیں بھی جانے نہ دوں گا۔ پکڑ کر رکھوں گا۔ باندھ کر رکھوں گا۔ کیسے جائے گی پھر —— قصور ڈیڈی کا ہے۔ ڈیڈی بُرا ہے، بہت بُرا —— ممی کو مارتا ہے —— ممی روتی کیوں نہیں! —— ہاں آج ڈیڈی روئے گا۔ کمرے میں اکیلے ہی سونا پڑتا ہے نا۔ آج وہ ڈائن جب یہاں ممی کو دیکھے گی تو بھاگ جائے گی۔ تب اور مزہ آئے گا۔ ممی سے ڈر جائے گی نا —— ! ممی کے بال نوچ لے گی —— اور پھر —— وہ ڈیڈی۔ ڈیڈی بھی تو کمرے میں اکیلے ہیں۔ ہوں —— ڈیڈی کو وہ کیسے ڈرائے گی۔ ڈیڈی سے تو ممی بھی ڈرتی ہے۔

اور ڈیڈی چھوٹے تو نہیں ہیں ——— وہ بڑے ہیں۔ ہمارے پی۔ ٹی ٹیچر جتنے۔
وہ ڈرپوک تو نہیں ہیں۔ وہ ڈائن کو مار ڈالیں گے۔ اور کیا۔ پھر کیوں ڈراتی ہے روز
روز مجھے۔ میں اسے جان سے مار ڈالوں گا ——— مار ڈالوں گا۔

آہا ——— ہا ——— آج تو مزہ آگیا۔ مگر ——— مگر۔ یہ ممی کہاں گئی۔
ممی۔ ممی کو ڈائن کھا گئی ——— م۔ م۔ ممی۔ ممی! تم کہاں گئی ممی۔؟
ممی! ممی؟ ممی! ممی!! ——— تم یہاں ہو! پھر آگئی یہاں ——— ڈیڈی
کے پاس! ڈیڈی کو ڈر لگتا ہے کیا؟ ہا۔ ہا۔ ہا۔ ڈرپوک! ——— ڈیڈی
ڈرپوک!! ——— ڈرپوک!!!

سوال

آشا میری اکلوتی بیٹی ہے ـــــــ مَیں آشا سے بہت پیار کرتا ہوں

مَیں آنکھوں کا مشہور ڈاکٹر ہوں ـــــــ نامور ـــــــ

آپریشن کامیاب ہے اور چند گھنٹوں کے بعد آشا بیٹی سب کچھ دیکھ سکے گی ـــ

واہ ـــــ واہ یہ کمرہ، یہ مکان، وہ سڑکیں، پہاڑوں کی اُونچی اُونچی چوٹیاں، اُبلتے چشمے، گرجتے دل کش آبشار، لہلہاتے کھیت، ڈیم، فیکٹریاں اور اس کا مُرجھایا ہوا چہرہ ایک پھول کی طرح کھِل اُٹھے گا۔ واہ! ! مگر ـــــ ؟ ـــــ !! ـــــ ؟؟ ـــ

اُف ـــــ !!! ـــــ !

اس وقت سات بجے ہیں، بلیک آوٹ آٹھ بجے ہے اور نو بجے جب میں آشا کی پٹی کھول دوں گا تب ہر طرف ڈراؤنا اندھیرا چھایا ہوگا۔

سکوت کا عالم ہوگا ——— اور ———
کوئی ایٹمی دھماکوں کی آواز سُن رہا ہوگا، کوئی قہقہے، کوئی آہیں، کوئی ریڈیو کو کان سے لگائے امریکہ، روس، ایران، افغانستان، چین کی خبریں سنتا ہوگا اور میں فقط اپنے پھولتے ہوئے سانسوں کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنی گرفت آہستہ آہستہ ڈھیلی کرتے ہوئے گھڑی کی ٹِک ٹک کی آواز سُن رہا ہوں گا ——— بے بس ——— لاچار ——— دل شکستہ ——— شکست خوردہ ——— میں سوچ رہا ہوں، تھوڑی دیر بعد آشا کی پٹیاں کھُل جائیں گی۔ لیکن اس اندھیرے میں اسے کچھ نظر نہیں آئے گا۔ وہ گھبرا جائے گی اور مجھ سے کہے گی۔

"مجھے کچھ دکھائی کیوں نہیں دے رہا ہے۔"

میں اس سے کیسے کہوں گا کہ مجھے بھی کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے ———!!

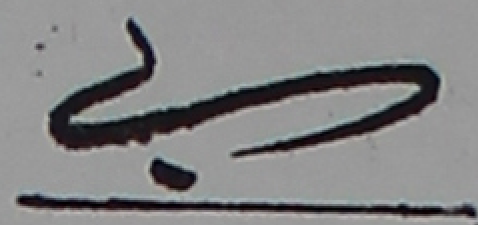
اُف ———!!

نادان

اماں ! آماں !! ——— سونو سو گیا، مونو بھی ۔ مجھے نیند نہیں آرہی ہے ؟ ——— لیکن ! لیکن ! تم یہ کیا کر رہی ہو؟ ؟ ہاں ! سمجھ گیا آماں ! تم ڈائن ہو! آج بھی ہمیں ٹال کر جلدی جلدی خود کھانا کھانا چاہتی ہو ——— آنکھیں کیوں دکھا رہی ہو ؟ کیسے سو جاؤں ؟ مجھے نیند نہیں آرہی ہے ——— !!

آماں ! آماں !! تمھیں بھی بہت بھوک لگی ہے نا ؟ مجھے تھوڑا سا کھانا دے دو گی ؟ میں سونو مونو سے کچھ بھی نہیں کہوں گا ——— آماں - آماں بہت بھوک لگی ہے۔ دو نا آماں ——— کھانا دو گی ؟! آماں تم کتنی اچھی ہو! آماں ! آماں !! تمھارا کھانا کیوں تیار نہیں ہو رہا ہے ۔ جلدی کھانا پکاؤ آماں - پھر وہ سونو مونو بھی جاگ پڑیں گے ۔ اُف آماں ! تم نکمی ہو ——— !

امّاں! آمّاں!! یہ ڈھکن اٹھا کر ہانڈی سے نکلتا ہوا بھاپ دکھا کر آج بھی مجھے ٹال دینا چاہتی ہو ——— تم کیسی ماں ہو؟ مگر آج تمھیں بھی کسی بھی قیمت پر اکیلے کھانا کھانے نہیں دوں گا۔ چھین کے کھالوں گا ——— ہاں! ہاں! ——— کون سا بیٹا۔ کیسا بچّہ! چل ہٹ جا۔ ہٹ! مگر یہ کیا ——— ؟ امّاں ہانڈی میں صرف پانی ہے۔ چاول کا ایک دانہ بھی نہیں۔ ہا۔ ہا۔ ہا۔ پھر تم ——— ہا! ہا۔ چاول پک جانے کا انتظار کیوں کر رہی ہو۔؟ امّاں۔ تم بھی کتنی نادان ہو! ———



اپنے پیارے بچوں

آشا

انل

اور

انیتا

کے نام

جگ بیتی

بُوڑھیا نے پھر کھڑکی کھول دی اور اپنے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھا کر کہنے لگی ——

"خدایا رحم! —— مجھ بے کس پر کرم!!" —— ترس کھا کر اپنا کوئی کرشمہ دکھا اور ایک اُڑتی ہوئی مُرغابی کو اس کمرے میں دھکیل دے ورنہ میری یہ ہڈیاں جھکنے سے پہلے ٹوٹ جائیں گی۔"

باہر زبردست برف باری ہو رہی ہے۔ بُوڑھیا سردی سے ٹھٹھر رہی ہے۔ مگر پھر بھی وہ آس لگائے بیٹھی ہے۔ اس کی آنکھوں میں اتنا پانی بھر آیا ہے کہ وہ لہو کے ان قطروں کو دیکھ نہیں پا رہی ہے جو چھت سے گرتے جا رہے ہیں۔ مگر ٹپ ٹپ کی یہ آواز چھت کے ساتھ لپٹی ہوئی ایک معصوم جان کو یوں سُنائی دے رہی ہے گویا ملک الموت کے

قدموں کی آہٹ ـــــــ کھُلی کھڑکی دیکھ کر وہ بھاگ جانا چاہتی ہے۔ مگر اس کے ارادوں کو بے بسی کی زنجیروں نے جکڑ کر حسرتوں میں بدل دیا ہے۔ گھاس پھوس کی چھت اس کا آخری سہارا ہے۔ اور یہ سہارا بھی اس کو اپنی ہی کمزور گرفت کی وجہ سے بے سہارا چھوڑ دینے کی دھمکی دے رہا ہے۔ اپنے لہولہان جسم کو دیکھ کر اسے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے پھانسی کا پھندہ سکڑ کر اس کی سانس روک رہا ہو۔ آنکھیں جب باہر نکلتی ہوئی محسوس ہوئیں تب ایک منظر سامنے نظر آیا۔ ہنستے کھیلتے، رقص کرتے ہوئے اس کے پیارے پیارے ساتھی۔ مگر اچانک !؟ ـــــــ آنکھوں کی حرکت کے ساتھ ہی اس کارواں کو ایک سخت برفیلے طوفان نے تتر بتر کر دیا۔ اور ایک دل کش منظر ایک ڈراؤنے سناٹے میں بدل گیا۔ اپنے لہولہان بچوں کو برف کی سفید چادر پر گرتے دیکھ کر بھی اس نے زندہ رہنے کی خاطر کئی گھنٹوں کی مسلسل جنگ لڑی مگر پے در پے شکست اسے دشمن کی طاقت کا یقین دلا چکی ہے۔ اس کا گھر والا، بھائی بہن، ماں باپ یا تو مارے گئے ہیں یا پھر ایک دوسرے سے بچھڑ کر جنگل میں کھو گئے ہیں آنکھ بھر آئی تو وہ دائیں بائیں یوں دیکھنے لگی گویا کسی گھنے جنگل میں مسیحا کو تلاش کر رہی ہو۔

اچانک ایک سنسناہٹ ہوئی اور ایک سرگوشی نے اس کے سانسوں کی رفتار تیز کر دی۔ کسی کی موجودگی کا احساس یوں ڈرا رہا تھا جیسے کسی خندق میں چھپے ہوئے فراری جنگی قیدی نے قدموں کی آہٹ سن لی ہو۔

"کون ہو تم۔ ؟"

"تم تم کو کون ہو ؟ !"

"یہ میرا گھر ہے۔ پہلے یہ بتاؤ۔ کیا تم یہ ٹپ ٹپ کی آواز سن رہی ہو۔"

"ہاں۔ یہ میرے خون کی زبان ہے۔"

"گولی لگی ہے کیا ؟"

"ہاں۔"

"بہت درد ہو رہا ہے کیا؟"

"درد برداشت کر لوں گی۔ مگر ڈر میرے گلے کو دبوچ رہا ہے۔"

"کس سے ڈر لگ رہا ہے؟ مجھ سے!"

"نہیں اس بوڑھیا سے۔ مگر جواب سن کر تم ہنس کیوں رہے ہو؟"

"کیونکہ بوڑھیا کی نظر کمزور ہے۔ ہمیشہ نیچے دیکھتی رہتی ہے۔ تمھیں کہاں دیکھ پائے گی۔ اور سنو بوڑھیا اونچا بھی سنتی ہے۔ گھبراؤ نہیں۔"

"یہ بوڑھیا کیا بڑبڑا رہی ہے۔"

"تم بھی اونچا سنتی ہو کیا؟"

"نہیں۔ مگر یہ زبان سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔"

"پردیسی ہو۔"

"ہاں! مگر تمھاری زبان سمجھ رہی ہوں۔"

"تم کون ہو؟ آرین، منگول، دراوڑین۔"

"معلوم نہیں۔ مگر اتنا بتا سکتی ہوں کہ ہمارے علاقوں میں بہت برف گرتی ہے۔"

"اچھا، اچھا۔ سائبیریا کی رہنے والی ہو۔ مگر تم یہاں کیسے چلی آئیں۔؟ رہنے دو۔ رہنے دو۔ یہ کہانی پھر سہی اس وقت اپنے لب سی لو۔ وہ دیکھو اس شخص کے سر میں زہر ہے اور نگاہوں میں قہر۔ بندوق میں بارود ہے اور اس کی انگلی گھوڑے پر۔"

"وہ کیا یہاں کا بادشاہ ہے؟"

"نہیں۔ اس جھونپڑے کا مالک ہے۔ خالی ہاتھ آیا ہے اس لیے مارے گا اس بوڑھیا کو۔"

"کیوں؟ کھڑکی کھلی رکھی ہے بوڑھیا نے اس لیے؟ سردی سے وہ ٹھٹھر رہا ہے اس لیے؟"

"نہیں۔ یہ شخص برفیلے طوفانوں کا ہی انتظار کرتا رہتا ہے۔ جیسے ایک کسان بارش کا جیسے قالین بنانے والا بچہ اون کا۔"

"پھر اس بوڑھیا کا کیا قصور ہے؟"

"اس کی غفلت کی وجہ سے وہ جیتی بازی ہار گیا ہے۔"

"جوا کھیلتا ہے کیا؟"

"نہیں! شکار!! سنو! میں یہاں بیٹھا تماشا دیکھ رہا تھا۔ آج صبح چند مرغابیاں کہرے سے اندھی ہو کر کمرے میں چلی آئی تھیں۔ بوڑھیا کو ان کی حالت پر ترس آیا۔ ایک ایک کو اٹھا کر باہر نکال دیا۔ بیٹے نے دیکھا تو کوڑے برسائے۔ مگر یہ سن کر تم کیوں لڑکھڑا رہی ہو؟ کھڑکی دیکھ کر یا شکاری کی آنکھ دیکھ کر؟"

"خون کے ان قطروں کو دیکھ کر۔ جن سے میری شناخت ہو سکتی ہے۔"

"تو پھر بھگوان کا نام لو۔"

"وہ کون ہے؟"

"مجھے کیا معلوم۔ مگر وہ ہے۔ جو بھی ہے مگر ہے۔ میرے ساتھیوں کو تو نہیں بچا سکا مگر مجھے بچا لیا ہے اس نے۔"

"کس نے مار ڈالا ان کو؟"

"اسی راکشش نے۔ دیکھو تو کتنی بے رحمی سے پیٹ رہا ہے اپنی ماں کو۔"

"کیا یہ مرغابیوں کا تاجر ہے؟"

"کیوں۔ تم کیا ان کی ٹریڈ ایجنٹ ہو؟"

"نہیں۔ میں ان کی ترجمان ہوں۔ میرا خون ابل پڑا ہے۔ کیا یہ لوگ ہمارے

گوشت کا سودا کرتے ہیں؟ ہم ان کے خلاف آواز اُٹھائیں گے۔ ہمارے ہاں سب کچھ ہماری مرضی سے ہوتا ہے۔"

"کھانا ملتا ہے سب کو؟"

"ہاں رہنے کو گھونسلہ بھی۔ ہم سب ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔"

"مجھے اپنے ساتھ لے چلو گی۔"

"تم اکیلے ہو؟"

"ہاں! مگر میرے کئی ساتھی تھے۔ اس راکشس سے تنگ آکر ہم کبھی کھیتوں میں رہتے تھے اور کبھی مل کی چھت پر۔"

"یہ مل کیا ہوتی ہے؟"

"ایک بہت بڑی عمارت جہاں مزدور کام کرتے ہیں۔ میرا دوست وہاں قالین بناتا ہے۔"

"دوست کا نام لے کر آواز بھر کیوں آئی؟"

"وہ اپنے ننھے ہاتھوں سے بڑے بڑے قالین بناتا تھا۔ ان سے مجھے اور میرے بچوں کو دانے کھلاتا تھا۔ مگر اُف میرے بچوں کو بارود نے اُڑا دیا اور اس دوست کو دق کی بیماری کھا گئی۔"

"اف! تمھاری آپ بیتی سن کر کلیجہ منہ کو آ رہا ہے۔ ہم دونوں مظلوم ہیں۔ شاید یہ جگ بیتی بھی ہے۔"

"ہم پرندوں کی کہانی آج کے انسان کی داستان ہے۔"

"میں تمھیں اپنا ہم سفر بناؤں گی۔ مگر! ۔ مگر؟ ۔ ایک بدیشی مُرغابی اور ایک دیسی تیتر کا بندھن کیسے ہو سکتا ہے۔"

ہم پرندے ہیں۔ انسان نہیں! ——— کیا ہوا۔ خاموش کیوں ہو گئے؟ ۔ درد

ہو رہا ہے کیا! ؟ ——— برداشت کر لو۔ کیا تم اس بہتے ہوئے لہو کو اپنے آہنی ارادے سے روک نہیں سکتیں۔

"مگر کیسے ؟ خون کا بہاؤ سانسوں کی رفتار سے بھی تیز ہے۔ لگتا ہے یہ خون سانسوں کو پیچھے دھکیل کر بہت آگے جا چکا ہے۔ کھڑکی کھلی ہے مجھے میرے حال پر چھوڑ کر تم بھی سائبیریا چلے جاؤ۔ میرے ساتھیوں کو میرا سلام کہہ دو۔ پھر کچھ اپنی کہو۔ کچھ میری سناؤ۔ ہاں تیتر بھاگ جاؤ۔ میں تمہارا ساتھ دے نہیں سکوں گی۔ میرے دونوں پر بوجھل ہو گئے ہیں۔"

"ہاں! دیکھ چکا ہوں۔ مگر کیسی نادان ہو تم۔ پھڑپھڑاہٹ کی آواز سن کر کیا وہ گولی نہیں چلا دے گا؟ اس بارود میں بہت طاقت ہے، اڑا دیتی ہے، مزدوروں کی کاوشوں کو ——— اور پھر اگر اس وقت یہاں خطرہ نہ بھی ہوتا تب بھی میں تمہیں اکیلا چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں۔ ہمیں ایک نیا سفر شروع کرنا ہے۔ سحر کی پہلی کرن خوفناک تاریکیوں کو ختم کر دیتی ہے۔ آؤ ——— قریب آؤ ——— ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر سحر کا انتظار کریں۔"

"ہاں۔ مگر میری گرفت کمزور کیوں ہوتی جا رہی ہے؟"

بوڑھیا سو گئی اس کا بیٹا بھی سو گیا مگر پھر بھی خوف کی سرد لہریں دونوں پرندوں کی رگ رگ میں دوڑتی رہیں چونچ سے چونچ ملا کر وہ دونوں ہلکی ہلکی آنچ محسوس کرتے ہوئے اپنے ارادوں کو پختہ کرتے رہے۔ سرگوشی کے انداز میں وہ دونوں آنے والے کل کے بارے میں سوچتے رہے، جب آنکھ لگ گئی تب دونوں نے ایک دلکش خواب کو اپنی آنکھوں میں سمیٹ لیا۔ مرغابی کی تھرتھراہٹ سے جب بھی ان کا یہ خواب لرزتا نظر آیا تب تب تیتر اس کو سہارا دیتا رہا۔ گویا ایک زبردست طوفان تھا جس کو تیتر اپنے کمزور پروں سے روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یا یہ کہ ایک رسّی تھی جس کو پکڑ کر مرغابی دلدل سے باہر نکلنے کی سعی کر رہی تھی۔

سحر کے وقت جب تیتر کی آنکھ کھلی تو اُس نے اپنے آپ کو تنہا پایا۔ وہ بڑبڑانے لگا۔ کچھ غصّے سے، کچھ دل شکستہ ہو کر۔

"دھوکے باز۔ بھاگ گئی مجھے تنہا چھوڑ کر ذلیل! مرغابی تم نے یہ ثابت کر دیا کہ تمھارا وجود بھی ان کتابی باتوں کے مانند ہے جو جذبات کو چھو کر خیالات کو اُلجھا دیتے ہیں۔"

گھاس پوس کی چھت سے اپنا سر نکال کر اس نے نیچے دیکھا بوڑھیا چولہے کے سامنے بیٹھی اپنی کمزور انگلیوں سے مُرغابی کی کھال اُتار رہی تھی اور بیٹا بندوق کی نالی صاف کر رہا تھا۔

یہ دردناک منظر دیکھ کر تیتر فرش پر ویسے ہی گر پڑا جیسے ایک ناکام باغی کے ہاتھ سے تلوار یا ایک منتشر کارواں کا جھنڈا۔

بوڑھیا تیتر کو دیکھ کر چونک پڑی اور اس کے حلق میں پھنسی ہوئی بات باہر نکل آئی۔
"خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم غریبوں کی تو ہی سنتا ہے مگر اے کاش یہ کرشمہ کل ہُوا ہوتا تو شاید ہم لوگ بھوکے نہ سوتے۔"

بیٹے نے بندوق دُور پھینک دی اور اُچھل کر تیتر کو دبوچ لیا اور پھر اس کی گردن مروڑ کر وہ شہر جانے کی تیاری کرنے لگا۔

آج وہ دونوں بہت خوش ہیں۔ صرف اس لیے کہ ایک مُرغابی اور تیتر کے عوض ان کو مل کے مالک سے دو دن کا راشن اور دو عدد کارتوس ملنے والے ہیں۔

○○

کاکو

وہ میرے سامنے ایک بُت کی طرح کھڑا رہا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھتا رہا۔

دن بھر بلا ضرورت بک بک کرنے والے اس لڑکے کے ہونٹ آج پہلی بار میں نے یوں تھرتھراتے دیکھے جیسے ایک بے بس پرندہ اپنے کٹے ہوئے پنکھ سے پھڑپھڑا رہا ہو۔ جانے وہ کچھ کہنے کے لیے اپنے ٹھنڈے ہونٹوں کو ہلانے کی کوشش کر رہا تھا یا کچھ نہ کہنے کے لیے تھرکتے ہونٹوں کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

یوں تو اُس کی باتیں سنتے سنتے میرے کان پک گئے ہیں۔ جہاں بھی مل جاتا ہے بس ہاتھ ملایا اور یوں بولنے لگتا ہے جیسے ٹیپ ریکارڈ کا سوئچ آن کیا گیا ہو۔ توڑ موڑ کر وہی باتیں کرنے کا وہ عادی ہو چکا ہے۔ جیسے ایک خود ساختہ شاعر اِدھر اُدھر کے شعر جوڑ

کردیا اپنے ہی مخصوص کلام کو توڑ مروڑ کر سنانے کا عادی ہو چکا ہو۔ اس کے سلسلہ وار مکالموں کو اگر میری غیر دلچسپی یا مجبوری ٹوکنا بھی چاہتی تب بھی وہ خاموشی سے گھر جانے والا نہیں ہے۔ جاتے جاتے بھی کچھ نہ کچھ یوں کہتا رہتا ہے جیسے کسی آنے والی فلم کا ٹریلر دکھاتے کے لیے اصرار کر رہا ہو اور پھر ذرا سی بات کی اتنی لمبی تمہید باندھ لیتا ہے کہ ٹریلر ہی بدلات خود ایک طویل فلم بن کر سامنے آجاتی ہے۔ حالانکہ مفہوم وہی جانا پہچانا۔ کار، فریج، کولر، عمارت، فون، باغ، مہمان، ڈنر پارٹیاں وغیرہ یوں گھنٹوں بیت جاتے ہیں اور اکثر ہم دونوں کو گئی رات اپنے اپنے گھر لوٹنا پڑتا ہے۔ فقط برآمدے میں سوئے ہوئے بھاگتے کتوں کی خوفناک وعف وعف کی آواز سننے کے لیے یا پھر گھر والوں کی گرجدار آواز سننے کے لیے جو کبھی کبھی وجود کو ہلا دینے والا زلزلہ ثابت ہوتا ہے۔ جبھی تو آج بھی میں نے اس سے نظریں بچالی تھیں۔ گلی کوچوں میں چھپتا رہا مگر وہ مہینوں سے ایک شکاری کتے کی طرح میرا پیچھا کر رہا تھا۔ اور آج بازار کا چپہ چپہ سونگھ کر ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

مجھے ڈر تھا کہ وہ بغل گیر ہوتے ہی اچانک نظریں پھیرنے کی وجہ پوچھے گا۔ پھر گلے شکوے ہوں گے۔ مگر ہاتھ ملاتے ہی وہ یوں بولنے لگا جیسے ایک اناؤنسر وقت برباد کیے بغیر ایک ٹوٹے ہوئے سلسلہ کو وہاں سے شروع کرنے لگا تھا جہاں وہ چھوڑ آیا تھا۔ وہ نان اسٹاپ بولتا رہا اور میں غور سے نہ سنتے ہوئے بھی سمجھ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اچانک مجھے اس کے ایک برجستہ مکالمے نے چونکا دیا۔ وہ بار بار بے نظیر تحفے کی بات کر رہا تھا اور مجھے دکھانا چاہتا تھا۔ مجھے کیوں؟ میں اپنے آپ سے سوال کرتا رہا جب کہ وہ پنکچر شدہ ٹائر کی طرح گھسیٹ گھسیٹ کر مجھے اپنے گھر تک پہنچانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ ایک بہشت مانند باغ کے درمیان ایک بڑا سا مکان دلکش بھی تھا اور باوقار بھی۔ بالکل ویسا ہی جیسا اس نے کہا تھا۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی ٹھنڈی

ہواؤں کا لمس اور پھر یخ پانی کی ٹھنڈک کے احساس سے۔ جانے کیوں باہر کی جھلس دینے والی گرمی کچھ زیادہ تکلیف دہ محسوس ہونے لگی اور میں اُس کی تقدیر پر رشک کرنے لگا۔ مگر اچانک گویا چھت سے گولے برسنے لگے۔ مالکن کی آواز میں سورج کی گرمی سے زیادہ آگ تھی۔ مالکن کا غصّہ جائز تھا۔ آخر دس منٹ کا راستہ اگر ایک گھنٹہ میں بلاوجہ طے کیا جائے تو یہ غیر ذمّہ داری کا ایک ٹھوس ثبوت ہی تو ہے۔ کاکو کا رنگ اُڑ گیا اور گردن یُوں جھک گئی جیسے ہوا نکلتے ہی ایک کھلونے کا جسم۔ میں کاکو کے گھر آج پہلی بار آیا تھا، شاید اس لیے ہم دونوں تین مہینے پہلے اتفاقاً ملے تھے۔ کاکو کے مالک نے اپنے بیٹے کی سال گرہ منانے کے لیے پارک میں ایک بہت بڑی پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ انتظام اُسی ہوٹل والے کا تھا جہاں میں پچھلے پانچ سال سے ملازم ہوں۔ اُس روز بھی میں برتن صاف کر رہا تھا اور کاکو کسی مہمان کے بچّے کو گود میں اُٹھائے سائبان کے باہر چکّر لگا تا میرے پاس آکر گئی رات تک بیٹھا تھا۔

اُس روز اس کی باتیں مجھے بہت اچھی لگی تھیں۔ وہ بات بات پر قہقہے لگا تا تھا۔ اور اپنی باتوں سے میرے شکستہ دل کو تھپکیاں دیے جا رہا تھا۔ ورنہ جنوری کی سردیوں میں گھنٹوں پانی کے ساتھ کیسے کھیلا جا سکتا تھا۔ جبھی سے وہ مجھے اپنا بہترین دوست سمجھنے لگا ہے۔ اور میں نے بھی یادوں کے بیابانوں میں چلتے چلتے آخر ایک نخل پالیا تھا۔

مالکن کی باتیں اتنی کڑوی نہیں تھیں جتنی مجھے گھر میں سُننی پڑتی ہیں۔ یہی احساس جب میں نے کاکو کو فوراً دلایا تو وہ اپنی شرمندگی و شکست خوردہ چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ کا لبادہ اوڑھ کر قہقہے لگا تا ہوا اپنے کام کے ساتھ ایسے جُٹ گیا۔ جیسے مقناطیس کے ساتھ لوہے کا ٹکڑا۔ بہت ہی تیز رفتار سے اُس نے سبزی کاٹ لی۔۔۔ چائے بنائی، انڈے اُبالے۔ اور پھر کپڑے دھونے لگا۔ پریس کرنے لگا۔ جوتے پالش کرنے لگا۔ چھوٹے مالک کے تسمے باندھنے لگا۔ بڑے مالک کا بریف کیس کار میں رکھا۔ کار کا

شیشہ آستین سے صاف کیا اور پھر گھر کی چابیوں کا گچھا گھر کی مالکن کو دے کر معمول کی طرح جب وہ دہلیز پر بیٹھ کر دائیں بائیں دیکھنے لگا تو مجھے محسوس ہوا کہ ایک ناگ ہیرے جواہرات بھرے خزانے کی رکھوالی کر رہا ہے۔ باہر صحن میں چکر لگاتے لگاتے جب میں نے پچاسویں بار نلکے کے ساتھ منہ لگا کر پانی پیا تو پانی کی شر شر کی آواز نے اُسے چونکا دیا اور اُسے اپنا دوست یاد آیا۔ یعنی میں! گیرج کے اوپر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ ایک طرف کچھ فالتو سامان پیٹیاں، وسکی اور بیئر کی خالی بوتلیں اور ایک کونے میں فرش پر بچھی ہوئی دری۔ یہی کاکو کا کمرہ تھا اور جب کاکو نے مجھے اپنے کمرے میں جانے کے لیے کہا۔ تب میں کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح سیدھے نشانے پر لگ گیا۔ دراصل باغ میں بہت گرمی تھی۔

کاکو دہلیز میں بیٹھا رہا۔ گویا اس کی آنکھیں اپنے گھر کے حدود کی نگہبان تھیں۔ ایک پالتو کتے کی طرح وہ بار بار حرکت میں آتا رہا اور چلاتا بھی رہا۔ کون ہو بھائی تم؟ کیوں اندر آئے ہو؟ یہ کیلے کے چھلکے ہمارے باغ میں پھینک دیے۔ تم ڈاکیہ ہو تو کیا ہوا۔ یہ پھول کیوں توڑے؟ خبردار جو ہمارے نلکے میں سے پانی بھر لیا۔ ہوں، ہماری کیاریاں گرمی سے سوکھ رہی ہیں۔ میں نہیں دوں گا یہ کرکٹ بال کیا کر دگے، مارو گے تو پھر مارو۔ یہ بال تمھیں واپس نہیں لوٹاؤں گا۔ دیکھتا نہیں ہمارا شیشہ توڑ ڈالا۔ اس کا چہرہ غصہ سے لال ہوتا رہا اور جب وہ مجھے دیکھتا تھا۔ تب غصہ یوں ٹھنڈا ہو جاتا جیسے ایک شعلہ پانی کے ٹب میں ڈالا گیا ہو، مسکرا کر پھر وہ وہی باتیں سناتا رہا۔ کل ہمارے یہاں پارٹی ہو رہی ہے۔ بڑے مہمان آئیں گے۔ دیکھ لینا یہ گھر کل ہیروں کی طرح چمک رہا ہوگا۔ ہیرے کبھی دیکھے ہیں؟ میں نے بھی نہیں دیکھے ہیں! مگر؟ اچانک اُسے یاد آیا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ کیوں لایا تھا۔ وہ ایک گیند کی طرح اُچھل کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ یہ دیکھ۔ یہ دیکھ!! اس وقت کاکو کا چہرہ

ایک چمکیلی صبح کی طرح نظر آرہا تھا مگر میں اخبار کے کئی اوراق کے اندر چھپے ہوئے اس بے نظیر تحفے کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔

کاکو نے میری کیفیت بھانپ لی تھی اور ایک شہزادے کی طرح اکڑ کر بہت ہی باوقار طریقے سے اپنی پھٹی پرانی گنواڑ ٹائپ کی قمیض اُتار پھینکی تھی اور اخبار کے اوراق بھی بیچ سے نکلی ہوئی برف کے مانند سفید قمیض پہن کر جب اُس نے مجھ پر رعب ڈالنے کی خاطر بھوئیں چیست کیں تب میں کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔ میری مسکراہٹ کو بالکل ہی نظرانداز کرتے ہوئے وہ خوشی سے جھوم کر ریشمی قمیض پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اچانک یوں چونک پڑا تھا جیسے چلتے چلتے پاؤں کھائی کی طرف جانے لگے ہوں قمیض پر لگے ایک بدنما داغ پر ہاتھ رکھ کر پھر بھی سوالیہ نگاہوں سے تصیدے کی فرمائش کرنے لگا تو میں خاموشی سے قمیض کو دیکھتا رہا۔ بڑے بڑے کالر، لمبے لمبے آستین گویا ایک خیمے کے اندر کسی کو قید کر دیا گیا ہو۔ "بڑے مالک نے دی ہے کیا؟" میں نے ایک کنڈم شدہ خیمے میں بیٹھے ہوئے قیدی سے پوچھا اُس نے ہاں میں سر ہلایا اور میرے چہرے کے مفلوج تاثرات دیکھ کر وہ بھی میرے ساتھ مایوسی کے سمندر میں غوطے لگاتا رہا۔ مگر اچانک وہ اپنے آپ کو ایک جھٹکا دے کر قہقہہ لگاتا۔ یوں مجھے دیکھنے لگا، جیسے کہہ رہا ہو۔ دوست یہ تحفہ نہیں۔ میں دُوسرا تحفہ دکھانے کے لیے تمھیں اِدھر لایا ہوں۔ جس اعتماد سے وہ کہہ رہا تھا میں سمجھ رہا تھا کہ کوئی ہیرا ہوگا۔ مگر اس نے بہت بڑے سائز کی قمیض اُتار کر ایک خوبصورت رنگ برنگی قمیض مجھے دکھائی۔ میں نے ہاتھ سے چھُوا۔۔۔ قمیض بہت ملائم تھی جیسے خرگوش کے بال میرے چہرے پر اُبھرتے ہوئے عکس دیکھ کر اُس نے سیٹی بجائی اور معمول کی طرح کار، فرج، گھر کی باتیں کرتا ہوا وہ قمیض کو پہننے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر اس کوشش میں اس کے دونوں ہاتھ یوں اوپر اُٹھ گئے جیسے شکست تسلیم کر رہا ہو۔ چہرہ قمیض سے یوں ڈھک گیا

جیسے پھانسی کا پھندا گلے میں ڈالنے سے پہلے آنکھوں پر کالا پردہ ڈال دیا گیا ہو قمیض بہت ہی چھوٹے سائز کی تھی اور کاکو کے چھوٹے مالک کی دو سال پرانی قمیض تھی۔

کاکو نے ماضی کا کفن اُتار کر مستقبل کا پھندہ گلے میں ڈال لیا تھا۔ گویا اس کا ماضی، حال مستقبل ایک ہی تصویر کے مختلف عکس تھے۔ بڑی مشکل سے جب میں نے اس کی قمیض اُتار دی تب وہ ہنستے ہنستے رو پڑا اور پھر بُت کی طرح دیکھتا رہا اور تب سے اب تک وہ ٹکٹکی لگا کے مجھے دیکھ رہا ہے۔

"تم کچھ بولتے کیوں نہیں؟"

میں نے جانے سے پہلے ایک بار پھر پوچھا۔ مگر وہ کبھی میری نم آنکھوں میں اپنے چہرے کا عکس دیکھتا رہا اور کبھی وہ گھر جہاں وہ بچپن سے ہی برتن صاف کرتا آیا ہے۔ اور گھر کے ہر چھوٹے بڑے کی خدمت کرتا آیا ہے اور جس گھر میں رہ کر بھی وہ گھر والا نہیں ہے۔ فقط ایک نوکر!

اپنے باپ کی طرح، اپنے دادا کی طرح۔۔۔ یا اپنی اگلی پشتوں کی طرح!!! ہم لوگوں کی طرح۔۔۔ اُف نخلستان جہاں کہاں کھو گیا تھا۔ شاید کاکو وہ نخل نہیں تھا جس کا سایہ مجھے ٹھنڈک پہنچا دیتا۔ وہ خود معاشرے کے بیابانوں میں گم ہو گیا تھا۔ اُف! کاکو مجھے آج کیوں ملا تھا۔؟!! اُف۔ اُف!!

چھوٹی سی گڑیا کی لمبی کہانی

یہ لڑکا آخر کچھ بولتا کیوں نہیں ہے؟ اگر یہ گونگا ہے تو ظاہر ہے بہرہ بھی ہوگا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ ہارن کی آواز سنتے ہی وہ دوڑتا چلا آتا ہے۔ اور کار کے شیشوں سے جھانک جھانک کر چھت پر لٹکتی ہوئی گوڑیا کو دیکھتا رہتا ہے یا پھر سڑک کے کنارے گھنٹوں بیٹھا ہر راہگیر کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تکتا رہتا ہے۔ آخر یہ میلا کچیلا لڑکا چاہتا کیا ہے؟ ہاں شاید اُسے گڑیا پسند ہے یہ پیاری سی گڑیا مجھے بھی پسند ہے۔ مگر میں دو بچوں کا باپ اور یہ آٹھ یا نو سال کا بچہ! کیا ہماری مشترکہ پسند ہمارے احساسات و جذبات کی عکاسی ہے؟ نہیں نہیں!! بچہ کھلونے سے پیار کر سکتا ہے اور میں، ہا ہا۔ ھھ۔ اُف! یہ سوچ کر میں اپنے آپ پر ہنس پڑتا ہوں ——— اتنا ہنستا ہوں کہ آنکھیں بھر آتی ہیں۔ ایک عجیب سی کیفیت مجھ پر طاری ہو جاتی ہے۔ اور میں انجانی راہوں پر، منزل کا تصور کیے بغیر بہت تیز رفتاری سے

گاڑی چلاتا رہتا ہوں۔ کبھی سحر سے شام تک اور کبھی شام سے سحر تک۔

چلتے چلتے جب کبھی میں سرگوشیوں کی آواز سن کر کار کی پچھلی سیٹ کو دیکھتا ہوں تب گڑیا مجھ پر ہنس پڑتی ہے اور ہم دونوں قہقہے لگاتے رہتے ہیں۔ آنکھیں بھر آتی ہیں تو ڈبڈبائی آنکھوں سے ایک خالی خالی کینوس پر کچھ نقش ابھر کر قریب آتے دیکھتا ہوں۔ قربت کا احساس گویا ایک اشارہ دے کر آرکیسٹرا شروع کرا دیتا ہے۔ ساز بجتے رہتے ہیں اور گڑیا جھوم جھوم کر بادِ گلستاں کی مستی سے ہم آہنگ ہو کر ناچتی ہے۔ یا پھر ایک بچی اپنے غرارے کا کونہ پکڑ کر مجھے اپنی چھوٹی چھوٹی پائیلیں دکھا کر درختوں کے پیچھے چھپ بار بار آنکھ مچولی کر کے مجھے کبھی، ادھر کبھی اُدھر دوڑنے کے لیے اکساتی ہے۔ مجھے ہی کیوں یہ گڑیا آس پاس کھڑے بچوں کو بھی اپنے اسکول کے نرسری گیت سنا کر ناچنے کے لیے مجبور کر دیتی ہے۔ مگر جب سے اسکول چھٹیوں کے لیے بند ہوئے ہیں ہم دونوں کو ساری کالونی میں یہی میلا کچیلا لڑکا نظر آتا ہے۔ جو فقط دیکھتا رہتا ہے نہ تے سے لے ملا کر گاتا ہے نہ قدم سے قدم ملا کر ناچتا ہے۔ کیسا ہے یہ لڑکا، تبھی ہم دونوں مایوس ہیں۔ اور آس پاس ہر وقت یوں دیکھتے رہتے ہیں گویا دھند میں کھو کر کسی کی تلاش کر رہے ہوں . . . اُف! اُف!! اس بار یہ چھٹیاں اتنی لمبی کیوں ہوتی جا رہی ہیں؟

یہ خوبصورت سی پلاسٹک کی گڑیا کوئی جادوئی گڑیا نہیں۔ مگر نہ جانے اس نے مجھ پر کیا جادو کیا ہے کہ ہر وقت اسی کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ کیا میرے بچے بھی اپنی پسندیدہ گڑیا کے بارے میں سوچتے رہتے ہوں گے۔ پھر لوان کو بار بار میرا بھی خیال آتا ہوگا۔ وہ اس گڑیا سے کتنا پیار کرتے ہیں۔ جب دیکھو گڑیا کے لیے کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں گڑیا کے لیے سردیوں کے کپڑے، گرمیوں کے کپڑے، گڑیا کی سوئٹر، گڑیا کی ٹوپی۔ ہاہا۔ یہ چھوٹے چھوٹے کپڑے کتنے پیارے ہوتے ہیں۔ واہ۔ ان کپڑوں کا لمس کتنا پیارا ہے۔ بار بار چھونے کو جی چاہتا ہے۔ تبھی میں روزانہ چھوٹے چھوٹے کپڑوں کو دیکھتا ہوں اور گڑیا کو

نہلا کر نئے نئے کپڑے پہنا دیتا ہوں۔ کبھی میکسی، کبھی اسکرٹ، کبھی ٹڈی، کبھی شلوار قمیض کبھی اسکول کی وردی اور کبھی فینسی ڈریس۔ ہاہاہا ـــــــ ہاہا۔ شاید یہ لڑکا طرح طرح کی یہ پوشاکیں دیکھنے کی خاطر دوڑتا بھاگتا کار کے قریب آجاتا ہے۔ اس کی اپنی قمیض پھٹی ہوئی ہے نا؟ نہیں نہیں میرا اندازہ غلط ہو سکتا ہے ـــــــ لیکن کمبخت، میرے کسی سوال کا جواب دے تو جان سکوں۔

یہ لڑکا میرے لیے ایک معمہ کیوں بن گیا ہے۔ یا پھر میں ہی بچے کے لیے ایک مشکل سوال ہوں۔ جسے وہ حل نہیں کر پا رہا ہے۔ اُف۔ یہ لڑکا۔ میرے احساسات و جذبات کو گھسیٹ کر نہ جانے کس دلدل کی طرف لیے جا رہا ہے۔ اس لڑکے کو یہاں سے بھگا دینا چاہیئے۔ مگر نہیں ـــــــ یہی تو ایک بچہ ہے جو ہر وقت نظر آتا ہے اور میری کار دیکھتے ہی وہ میرے قریب آجاتا ہے بہت قریب!!

میں آج بھی اس کے برفیلے چہرے کو دیکھتا ہوا یوں محسوس کر رہا تھا جیسے میں خود برف کی گہرائی میں ڈوبا جا رہا ہوں کہ ایک بچے کی آواز نے میرے احساسات کے سلسلے کو توڑ ڈالا۔ میں دوڑتا ہوا اپنے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو ایک بچے کو دیکھ کر یوں چونک پڑا جیسے کالے بادلوں کو دھکیل کر سورج سامنے آگیا ہو۔

ڈرائنگ روم میں چند مہمان تھے۔ اگر ان کے کپڑوں سے عطر کی مہک نہ آئی ہوتی تب میں سمجھتا کہ میرے نوکر کے رشتہ دار ہیں۔ آج کل جانے کون کب میرے گھر آتا ہے۔ گھر!؟ ہوں ـــــــ گھر گھر ہے جب گھر والے ہوں، ورنہ ایک مکان ـــ میرا مکان! شاید آج میں اپنے انجانے مہمانوں سے اپنا تعارف کروا دیتا مگر مہمان کے چھوٹے سے بچے نے میری ساری توجہ کھینچ لی اور میں گویا کیمرے کی آنکھ سے فقط اس بچے کو دیکھتا رہا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں، چھوٹا سا کوٹ۔ واہ جیسے ایک کھلونا چل رہا ہو۔ خوبصورت سا کھلونا جو دل بہلائے جا رہا تھا۔

"ہم پاس بیٹھے ہوں تو سونو دوسروں کے گھروں میں بھی شیر بن جاتا ہے اور جب کبھی ہمیں دفتر سے لوٹنے میں دیر ہو جاتی ہے تو اپنے گھر میں بھی ایک بھیگے ہوئے پرندے کی طرح اپنے گیلے پروں کو پھڑ پھڑاتا، کسی کونے میں یا دہلیز پر گم سم بیٹھا رہتا ہے۔"

سونو کا باپ اپنے بچے کی شرارتوں سے لطف اندوز ہو کر جانے اور کیا کہے جا رہا تھا۔ مگر مجھے فقط سونو کی توتلی باتیں سنائی دے رہی تھیں۔ ایک وہ لڑکا ہے جو بولتا نہیں اور ایک یہ ہے جو بولتا ہی جا رہا ہے۔ بات بات پر گالیاں دیتا جا رہا ہے۔ میرے بال کھینچے جا رہا ہے۔ بار بار میری عینک اُتارتا جا رہا ہے۔ دانتوں سے کاٹ کھانے کی کوشش کیے جا رہا ہے، پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے یہ سب بہت اچھا لگ رہا ہے۔ گویا بھیشم کی چھاتی پر ارجن کے تیر لگ رہے ہوں (بھیشم اور ارجن، مہابھارت کے دو کردار، بھیشم کی چھاتی پر جب ارجن کا تیر لگا تو وہ خوشی سے چیخ پڑا، یہ تیر تو اپنے ارجن کا ہے)

اپنے انجانے مہمانوں کو رخصت کرتے ہوئے جب میں سونو کی تلاش کرنے لگا تب میری نظریں نہ تو کار میں بیٹھے سونو کے چہرے پر رُکیں اور نہ ہی سڑک کے کنارے بیٹھے اس میلے کچیلے لڑکے پر رُکیں بلکہ میں کار کی چھت پر لٹکتا ہوا دھاگہ دیکھتا رہا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک جھٹکے کے ساتھ ہوا کے بدلتے ہوئے رُخ نے بادبان گرا کر کشتی کو بہت دُور پھینک دیا ہو۔

گڑیا کو سونو نے دبوچ لیا تھا وہ اس کے ناخن اور دانتوں کا مظاہرہ دیکھ کر مجھ پر ایک عجیب قسم کی کیفیت پھر طاری ہوئی تو میرا نوکر سونو سے گڑیا چھین لے گیا۔ مگر میرا کھلونا ٹوٹ چکا تھا۔ گڑیا کا لباس تار تار ہو چکا تھا اور جسم کے ٹکڑے علیحدہ علیحدہ۔

مہمان جا چکے تھے اور میں سڑک پر پھینکے ہوئے گڑیا کے ٹکڑوں کو دیکھ کر اپنے نوکر سے بار بار وہی سوال پوچھ رہا تھا جس کا جواب وہ کئی بار پہلے بھی دے چکا تھا۔

"کون تھے یہ بدتمیز لوگ؟ میں نے پھر پوچھا۔

"پڑوس میں رہتے ہیں۔ فون کرنے آئے تھے۔"

"فون!" میں چونک اُٹھا۔ اور دوڑتا ہوا اپنے کمرے میں جاکر خاموش فون کو دیکھتا رہا۔ جانے کب سے یہ خاموش ہے؟ مگر کیوں؟ میں سوچتا رہا۔ اور یوں محسوس کرتا رہا جیسے کوئی ایک خاردار تار میری چھاتی سے چیر کر نکالا جا رہا ہو۔

"اُف یہ چھٹیاں اتنی لمبی کیسے ہو گئیں؟"

میں نے اپنے شکستہ دل کو تسلیاں دیتے ہوئے اپنے دیوانہ پن پر مرثیہ پڑھنا چاہا تو اچانک ایک بچے کی آواز نے پھر مجھے چونکا دیا۔ گویا ایک سنگین رات کے بعد رنگین صبح دستک دے رہی تھی۔

"یہ کون رو رہا ہے؟" میں نے نوکر سے پوچھا۔ لیکن میرا نوکر اس میلے کچیلے لڑکے سے میری گڑیا چھیننے کی کوشش کیے جا رہا تھا۔ تو کیا یہ بوڑھا بھی اس گڑیا سے پیار کرتا ہے۔ لیکن کب سے؟ کیوں؟؟ کس کی خاطر؟؟؟

لڑکا کسی کی پرواہ کیے بغیر ٹوٹے کھلونے کو جوڑنے کی کوشش کرتے ہوئے بے تحاشا رو رہا تھا۔ گویا اس کی موٹی موٹی آنکھوں سے دو اُبلتے ہوئے چشموں کا پانی رواں ہو۔

روتے روتے وہ ہر راہ گیر کو یوں دیکھتا تھا گویا چہروں کے جنگل میں کسی جانے پہچانے چہرے کی تلاش کر رہا ہو۔ مگر کس کی؟ میں نے قریب جاکر لڑکے کو دوسری گڑیا دینے کا وعدہ کر کے اپنا ٹوٹا کھلونا مانگا تو میں نے پہلی بار اس کی معصوم آواز سنی گویا کسی پھوڑے کو چھوتے ہی وہ چیخ پڑا تھا۔

"نہیں نہیں۔ میں یہ گڑیا نہیں دوں گا۔ نہیں دوں گا۔ یہ گڑیا۔ یہ گڑیا تمھاری نہیں ہے۔ یہ میرے بابو کی گڑیا ہے۔"

لڑکا نہ جانے میرے کتنے سوالات کا جواب دے چکا تھا۔

"یہ لڑکا کون ہے؟" میں نے ڈرائنگ روم کے فرش پر بکھرے جرائد اور بچوں کی کتابیں اُٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"شمبھو کا بیٹا،" نوکر نے ان کھلونوں کو اپنی اپنی جگہ رکھتے ہوئے کہا۔ جن کو میرے بچوں نے سجایا تھا۔ اور سونو نے درہم برہم کیا تھا۔

"وہ کون ہے؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"وہی کٹھ پتلیاں بنانے والا ہمارا پڑوسی جو پچھلے ماہ ٹرک کے نیچے آ کر مر گیا۔"

میں نوکر سے کچھ اور بھی پوچھ لیتا مگر دل میں ایک ہوک اُٹھی جو میرے تمام سوالات کو دبوچ کر آنکھوں سے ایک جھڑی کی شکل میں نکل پڑی۔ اور میں رات بھر اندھیرے کمرے میں وائلن بجاتا رہا۔

ساز کی آواز کے ساتھ ساتھ مجھے رات بھر ساتھ والے کمرے میں ایک پُرسوز آواز سُنائی دیتی رہی۔ جیسے دُور دُور سے سمندر کی لہریں ساحل سے ٹکرا کر چیخ رہی ہوں اور پھر بے سہارا ہو کر واپس چلی جا رہی ہوں۔ سسکنے کی آواز یوں سُنائی دے رہی تھی، گویا کہیں دُور بہت دُور کسی کھائی میں پھنسا ہوا بچہ صدائیں دیے جا رہا ہو—— "ڈیڈی ڈیڈی —— بچاؤ۔ بچاؤ۔"

اچانک وائلن پھینک کر میں نے بجلی آن کی اور فون کے نمبر گھماتا رہا۔ تاکہ اس وقت اپنے بچوں سے بات کر سکوں —— مگر کس نمبر پر؟ —— جانے کیوں میں بار بار بھول جاتا ہوں کہ اس وقت میرے بچے اپنی ماں کے قریب سو رہے ہوں گے اور ان کی ممی برف کی چادر اوڑھ کر اس بدنصیب جہاز کے ٹکڑوں کے ساتھ کسی برفیلی چوٹی پر دفن ہو چکی ہو گی جس کو میں نے چار مہینے اور گیارہ دن پہلے رُومال ہلا ہلا کر وداع کیا تھا۔

کاش وہ لوگ اس ننھی سی گڑیا کو بھی ساتھ لے گئے ہوتے۔ اے کاش! یہ لڈو کا ہا ہا۔ اب اس ٹوٹے کھلونے سے کب تک دل بہلا سکے گا۔ نادان! نہ تو اس معصوم کا باپ لوٹ کر آئے گا اور نہ میرے بچے!!

مگر؟ پھر! پھر مجھے یہ ٹوٹا کھلونا کس لیے چاہیے؟ ——— کیوں چاہیے؟ کب تک چاہیے؟

دُھند

گُونجتی ہوئی شہنائیاں اچانک بند ہو گئیں۔
رنگ برنگے قمقموں سے سجائی گئی ایک عالی شان عمارت بیوہ کی مانگ کی طرح اُجڑ گئی اور دلہن لال جوڑا پہننے سے پہلے ہی بھاگ گئی۔ جو کچھ بھی ہوا اُس میں نہ تو دلہن کا قصور ہے اور نہ ہی مُراری کا۔ قصور اگر ہے تو فقط گوبند کا جو اس بار پھر خدشات کو نظر انداز کر کے اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشات کو پُورا کرنے کی خاطر ایک ایسے نامعقول فیصلے پر قائم رہا، جس کے عمل نے شادی کے جشن کو ریت کے ذرّوں کی طرح بکھیر دیا۔ حالانکہ قدم اُٹھانے سے پہلے مُراری نے ایک مخلص دوست و فرماں بردار نوکر کی حیثیت سے اس کو روکا تھا۔ ٹوکا بھی تھا۔ ہاتھ جوڑ کر التجا بھی کی تھی۔ مگر گوبند کو جب سے ۱۵ لاکھ روپے کی لاٹری ملی ہے۔ وہ کسی دانشور یا دانش مند کی رائے قبول کرنے کے بجائے اپنے فطری

تقاضوں کے اشاروں پر خود ناچنے یا اوروں کو نچوانے کا عادی ہو چکا ہے۔

چاہیئے تو یہ تھا کہ گوبند بدلے ہوئے حالات کے ساتھ سمجھوتہ کر کے اپنی دبی ہوئی خواہشات کے ایک چھوٹے سے دائرے سے نکل کر ایک وسیع مدار میں پرواز کرتا، سازگار ہواؤں کے رُخ سے پورا پورا فائدہ اُٹھا کر اپنی اونچی اُڑان کو دل کش بنا کر ایک گدھ کی طرح مُردوں کی تلاش کرنے کے بجائے ایک باز کی مانند ایک نئے افق کی تلاش کرتا، مگر اس کی دبی خواہشات کا مقصد اتنا بھاری ہے کہ وہ اُڑان سے پہلے بار بار اسی جگہ پر گرتا ہے۔ جہاں وہ کئی سال پہلے تھا۔

کل کے گوبند اور آج کے گوبند میں فرق جو ہے سو اتنا ہے کہ کل وہ ایک بے بس قلی تھا۔ بھوکا پیاسا ایک ایسا شخص جو اپنی خواہشات کو بے بسی کی چادر سے ڈھانپ کر اپنے شکستہ دل کے گوشوں میں چھپا لیتا تھا۔ مگر آج ——— آج وہ سیٹھ دولت رام ہے جو دولت سے ہر چیز خرید سکتا ہے۔ اپنی ہر خواہش پوری کر سکتا ہے۔ جبھی تو وہ ماضی کی تہوں کو ہٹا کر یادوں کی نوک سے کھرچ کھرچ کر اپنی دبی خواہشات کو نکال کر ان کو پورا کرنے کی خاطر بڑی بڑی رقم داؤ پر لگا دیتا ہے ——— یہ شادی بھی وہ اپنی ایک دیرینہ خواہش پوری کرنے کے لیے کر رہا تھا۔

ماضی کے دُھندلے خاکوں میں رنگ بھرنا ہی غالباً اس کی زندگی کا واحد مقصد ہے۔ اور اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کی خاطر وہ اکثر احمقانہ حرکتوں کا سہارا لیتا ہے۔

کل کا گوبند بھوکا ضرور تھا، مگر آج وہ بڑے بڑے کھانے کی میز لگوا کر دن میں چار چار بار یوں کھانا کھاتا ہے جیسے وہ اپنا پیٹ نہیں برسوں سے خالی پڑا گودام بھرتا جا رہا ہے۔

کل کا گوبند ننگا تھا اور آج وہ دن میں دس دس بار کپڑے بدلتا ہے۔ گرمی ہو یا سردی اُسے جب اوورکوٹ کا خیال آتا ہے تو وہ فوراً پہن لیتا ہے۔ رنگ برنگے کپڑے، کچھ

جدید طرز کے، کچھ پرانے طرز کے، کچھ راجوں مہاراجوں کے وقت کے، کچھ بھڑکیلے، کچھ زری دار کپڑے وہ بس خریدتا ہی رہتا ہے۔ کپڑوں کا انتخاب وہ فلمی پوسٹر دیکھ کر کرتا ہے۔ جب کبھی بیٹھے بیٹھے یوں ہی اس کو کسی پرانے فلم کے ہیرو یا ہیروئن کا کاسٹیوم یاد آتا ہے تب وہ سیدھا درزی کے پاس پہنچ جاتا ہے اور ایک ایک کاسٹیوم کے لیے وہ پانچ پانچ سو روپے بھی خرچ کرتا ہے۔ اپنے کپڑوں کے علاوہ وہ بچوں اور عورتوں کے کپڑے بھی خریدتا رہتا ہے۔ حالانکہ اس کی نہ تو بیوی ہے اور نہ ہی بچے ہیں۔

برسوں پہلے وہ ایک لال رنگ کی گاڑی دیکھتے ہی خیالوں میں کھو جاتا تھا۔ اور پھر کبھی کبھی فرضی اسٹیرنگ پکڑ کر موڑ کاٹتا رہتا تھا۔ فرضی بریک دباتا تھا ——— اور اب رقم ملتے ہی اس نے وہی کار خرید لی ہے اور اس کھٹارا گاڑی کو ویسے ہی چلاتا رہتا ہے جیسے گاڑی کا بوڑھا مالک جوانی میں چلاتا رہتا تھا۔ ایک فیلٹ ہیٹ پہن کر، منہ میں سگار رکھ کر ——— !

کل کا گوبند اپنے غریب والدین سے لڑتا جھگڑتا رہتا تھا، مگر آج وہ اپنے عالیشان مکان کے مختلف کمروں میں گھنٹوں گزارتا ہے۔ پیاری پیاری میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے، مگر کس سے ؟ یہ گفتگو اس کی ہم کلامی ہے۔ اس کے والدین کب کے مر چکے ہیں۔ گوبند کے عادات، رہن سہن، طور طریقے، بول چال پر فلموں کا گہرا اثر ہے اور اس کی یہی کیفیت کل بھی تھی اور آج بھی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کل وہ جب ہیرو کو چھری کی نوک سے سیب اٹھاتے دیکھتا تھا تو وہ چاقو کی نوک سے آلو یا پیاز اٹھا کر مزے لے لے کر ویسے ہی کھاتا تھا جیسے ہیرو سیب کھاتا تھا۔ اور آج وہ فلم کے کسی سیٹ سے متاثر ہو کر گھر میں ویسے ہی سیٹ لگواتا ہے اور خود ہیرو بن جاتا ہے۔ کبھی تلوار بازی کبھی فرضی محبوبہ کے ساتھ ٹینس کھیلتا ہے۔ کبھی اکبر بادشاہ کا لباس پہن کر فرضی انارکلی کا رقص دیکھتا ہے۔ گلاب کا پھول سونگھ سونگھ کر ——— اور کبھی وہ حاتم طائی

بن کر خیرات بانٹتا ہے۔ یہ سب وہ اپنی دبی ہوئی خواہشات کو پورا کرنے کی خاطر کیا رہتا ہے اور اس کی اس عجیب و غریب دُنیا میں کسی کا دخل نہیں ہے۔

پھر ایک دن اس کو شادی کا خیال آیا۔

شادی کا خیال آتے ہی اُسے اپنی من پسند ہیروئن یاد آئی۔ محبوبہ یاد آئی تو شادی کا خیال ارادے میں بدل گیا۔ تب مراری ایک موٹی رقم دے کر بمبئی سے ہیروئن کو لے آیا۔ ہیروئن بھی شادی کے لیے تیار ہو گئی۔

شادی طے ہوئی۔ شامیانے لگائے گئے۔ گوبند کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے مراری نے بالکل فلمی انداز میں ایک شاندار استقبالیہ دیا۔

ایک طرف لگن منڈپ، دُوسری طرف میراثنیں سہاگ گاتی رہیں۔ قوالی کا بندوبست بھی ہوا۔

ایک گوشے میں آگ پر ایک پورا بکرا رکھا گیا۔ اور دُور دراز سے ہزاروں روپے خرچ کر کے آدی باسی بلائے گئے تاکہ وہ آگ کے گرد چکر لگاتے ہوئے رات رات بھر گاتے رہیں، ناچتے رہیں۔ بالکل فلمی اسٹائل میں۔ اور طے ہوا کہ گئی رات دولہا دُلہن سہاگ رات منانے سے پہلے ان کا گانا سنیں گے۔

پروگرام کے مطابق جشنِ گرم گشش تھا۔ قابلِ تعریف تھا، مگر گوبند کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔

اور گوبند اپنے تمام وارڈروب کھول کر اپنے کپڑوں کا انتخاب کرنے میں مشغول تھا۔

مختلف پوشاکوں کو چھوتے ہوئے اُسے کئی فلموں کے سین یاد آتے رہے۔ پیارے پیارے رومانٹک سین، وصل و فراق کے سین۔ اچانک ایک مخصوص لباس دیکھ کر اسے ایک سین یاد آیا۔ سین کسی فلم کا تھا۔ ہیروئن ایک مہین سا گاؤن پہنے ولین

اچانک ہیرو مُنہ میں تلوار دبائے ایک فرشتے کی طرح کھڑکی سے چھلانگ لگا کر کمرے میں کود پڑتا ہے۔ دل شکستہ ہیروئن کے مرجھائے ہوئے چہرے پر تبسم نکھر آتا ہے اور وہ ہیرو سے لپٹ جاتی ہے۔

کئی سال پہلے جب گوبند نے یہ سین دیکھا تھا تب اُس نے جو گدگدی محسوس کی تھی ویسی ہی کچھ سنسناہٹ وہ آج بھی محسوس کرنے لگا۔ دراصل یہ گدگدی وہ روز سوتے وقت محسوس کرتا رہا اور جب بھی اس کی کیفیت یوں ہوا کرتی ہے۔ تب وہ سرہانے کے نیچے رکھی ہوئی ہیروئن کی تصویر دیکھتا رہتا ہے۔ حالانکہ غریبی نے اس سے اس کا فلمیں دیکھنے کا شوق چھڑا لیا تھا، مگر وہ تصویر ہمیشہ اس کے ساتھ رہی۔

گوبند نے جلدی سے وہی پوشاک زیب تن کر لی۔ فلدی دار ٹوپی، کندھوں پر لال رنگ کا چمکیلا ویلوٹ کا گاؤن، سنہری بٹنوں والا کوٹ اور ہاتھ میں ایک چمکیلی تلوار ——— آئینہ میں اپنی تصویر دیکھتے ہی اُس نے مراری کو حکم دیا کہ ہیروئن کو لال جوڑا پہنانے سے پہلے ویسا ہی ڈریس پہنایا جائے جو اس فلم میں ہیروئن نے پہنا تھا تاکہ گوبند سین کے مطابق اُس سے پہلے ڈرامائی انداز میں لپٹ جائے اور پھر شادی کی جائے۔

یہ مخصوص ڈریس گوبند کے وارڈروب میں موجود تھا، مگر ہیروئن کو یہ پوشاک پہننے میں سخت اعتراض تھا۔

مراری بے بس تھا ——— مگر ہیروئن گوبند کو سمجھانے کے لیے خود ہی اس کے کمرے میں چلی گئی۔

اس کی آمد کے ساتھ ہی گوبند چونک پڑا۔

اور پھر ایک دھماکہ ہوا۔

"کون ہے یہ عورت؟" گوبند چلّانے لگا۔

مراری نے سمجھایا کہ دُلہن وہی ہیروئن ہے جس کے ساتھ گوبند شادی کرنے کا خواہش مند ہے، مگر گوبند مراری کی دلیل وا اپیل ٹھکرا کر بس چلّاتا رہا۔

"یہ فریب ہے! یہ دھوکا ہے!! میری ہیروئن نازنین ہے۔ پھول کی طرح نازک۔ وہ لالہ رُخ ہے —— دفع کرو اس بڑھیا کو —— دفع کرو!!

دُلہن چلی گئی۔ مہمان چلے گئے۔ اور جشن کا رنگ یوں اُڑ گیا جیسے رنگولی کے اوپر زبردست بارش گر چکی ہو۔

کئی رات جب مراری نے گوبند کو سہارا دے کر بستر سے اُٹھایا تو اس کی زری دار ٹوپی گر چکی تھی۔ اور سفید بال برف کی چادر کی طرح نظر آنے لگے۔ تب گوبند چونک پڑا۔

اپنی مُرجھائی ہوئی آنکھوں پر موٹی موٹی عینکیں رکھ کر جب گوبند نے ہیروئن کے فوٹو کو غور سے دیکھا تب اُسے یاد آیا کہ تصویر ۳۰ سال پرانی ہے۔ اس نے کروٹ بدلی تو جسم درد کرنے لگا اور یوں محسوس ہوا جیسے وقت کی کروٹ نے جوانی کو بڑھاپے کے بوجھ تلے کب کا دفن کر دیا تھا۔

آج ایک طویل عرصہ بعد اُسے یوں لگا جیسے وہ دُھندلے دُھندلے خاکے جو اس کے فکری انداز کو گمراہ کرتے آئے تھے، دراصل اُس کی اپنی ناسمجھی کا عکس ہیں۔

اچانک اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ دُھند میں چلتے چلتے ایک گہری کھائی کے قریب رُک گیا تھا —— !

آدمی

وہ ملتجی نظروں سے اپنے اردگرد کھڑے اجنبی چہروں کو دیکھتا رہا۔ اُن کے معنی خیز فقرے سنتا رہا۔ بار بار اُٹھنے کی کوشش کرتا مگر ہر بار ریت کی دیوار کی طرح گر جاتا۔

اس کا جسم کانپتا رہا اور لوگوں کے قہقہے سُن کر اس کے ہونٹ ایک زخمی پرندے کی مانند پھڑپھڑاتے رہے اور جب وہ احساسات اور جذبات کو اپنے ہونٹوں سے ادا نہ کر سکا تو چیخ پڑا۔ چیخنے کے ساتھ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اور وہ ایک بچّے کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ دراصل وہ دل ہی دل میں اپنی احمقانہ حرکت پر خود بھی نادم تھا۔ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ وہ دَوڑ نہیں سکتا پھر بھی اُس نے دوڑ میں حصہ لیا۔ موقعہ کے افسر اسٹاپ واچ لیے دیکھتے رہے اور وہ دوڑ کر بھرتی ہونے والے نوجوان لوگوں کے

ساتھ سیٹی بجاتے ہی اپنی دونوں مٹھیاں بند کیے ہوئے گولی کی مانند اپنے نشان سے ہٹ گیا۔ حالانکہ وہ ابتدائی مرحلے ہی میں اَن فٹ ہو چکا تھا۔ اسے قطار میں کھڑے دیکھ کر بھرتی کرنے والے افسر نے اپنے ترش نیچی لہجے میں ٹوکا بھی تھا۔ اسے اپنی کمزوری کا احساس بھی دلایا تھا مگر وہ کہاں کسی کی بات ماننے والا تھا۔ اس کی اوٹ پٹانگ باتیں افسروں کو غصّہ دلا رہی تھیں اور آس پاس کھڑے لوگوں کے لیے تفریح کا سامان پیدا کر رہی تھیں ان کے قہقہے گویا اسے تسلیاں دیتے جا رہے تھے۔ جانے کیوں؟

اسے اپنے آپ پر بھروسہ تھا۔ اعتماد تھا۔ مگر یہ دونوں سہارے اسے چند گز دوڑتے ہی یوں بے سہارا چھوڑ گئے جیسے ایکسل سے جدا ہوا پہیہ گاڑی کو ایک جھٹکے کے ساتھ بے سہارا چھوڑ دیتا ہے —— وہ بھی زمین پر یوں گر پڑا جیسے چٹکی بجاتے ہی سگریٹ کی راکھ گر جاتی ہے۔

جوانوں کا انتخاب ہوا۔ دفتر بند ہوا۔ افسر چلے گئے۔ لیکن وہ دروازے پر لگے ہوئے تالے کو یوں دیکھتا رہا گویا اس کا مستقبل ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک تاریک کمرے میں بند ہو چکا ہو۔ کاش کوئی "کھل جا سم سم" کا سحر انگیز فارمولہ اس کے ہاتھ لگ جاتا۔ وہ ایک لمحے کے لیے سوچتا رہا۔

سورج غروب ہو گیا اور وہ افق میں شفق کی لالی دیکھتا رہا۔ بادل کے چند ٹکڑوں کو سورج کی طرف دیکھ کر اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی صدائیں دے کر اس سے کہہ رہا ہو کہ کہاں جا رہے ہو۔ میں تمھاری مرادیں پوری کر دوں گا۔

شام ہوئی تو چاند کی کرنیں دیکھتے ہوئے ماضی کی یادیں آسمان سے گر کر اس کی آنکھوں میں سما گئیں اور پلکوں کی ہلکی سی جنبش سے پانی کے قطرے بن کر اس کی میلی کچیلی آستین میں جذب ہو گئیں۔

یوں تو حالات نے اس کی یادداشت کو کھوکھلا بنا دیا تھا لیکن آج نہ جانے

کیوں اسے سب یاد آ رہا ہے۔ ماں کا چہرہ، باپ کی تڑپ، بھائی کی موت، بہن کی رسوائی، رشتوں کے زخم، دوستوں کی ہمدردی اور دشمنوں کا قہر، بات بات کے جھگڑے، جھگڑوں کا اثر اور اپنی کمزوری کا احساس!!

اس کا پہلا جھگڑا افٹ پاتھ پر جگہ حاصل کرنے کے لیے ایک ایسے طاقت ور شخص سے ہوا تھا جو عمر میں اس سے ۳۰ سال بڑا تھا۔ اس وقت اسے اپنی کمزوری کا احساس غالباً پہلی بار ہوا تھا اور تب سے یہی احساس اس کا تعاقب کرتے ہوئے اس کی قوت کو کھوکھلا بناتا آ رہا ہے۔ اسکول میں لڑکوں سے جھگڑا، آشرم میں ساتھیوں سے جھگڑا۔ راہ گیروں سے جھگڑا، نوکری نہیں ملی تو مالک سے جھگڑا، روزگار نہیں ملا تو مزدور سے جھگڑا دفتر میں بے ہوش ہو گیا تو افسر سے جھگڑا بخار آ گیا تو ڈاکٹر سے جھگڑا سردی لگ گئی تو دوکاندار سے جھگڑا۔ بھوک لگی تو خوانچے والے سے جھگڑا۔ بس جھگڑے ہی جھگڑے۔ یہی اس کا مقدر ہے اور یہ واقعات اس کو اس وقت بھی یوں نظر آتے ہیں جیسے گیلے گیلے جنیڈے کے نیچے پرانی تحریر۔ یہ گیلا گیلا جنیڈے دراصل اس کا وہ جذبہ ہے جس سے وہ اپنی کمزوریوں پر قابو پانا چاہتا ہے۔ فوج میں بھرتی ہونے کی خواہش بھی اسی جذبے کی تحریک تھی ——— لیکن آج بھی اس کا قدم بلکہ پہلا قدم دلدل میں پھنس گیا اور فوجی افسر نے گرجدار آواز میں کہا۔

"تم کمزور ہو ——— بہت کمزور۔"

"نہیں صاحب یہ ہڈیاں فولاد کی ہیں۔ میں بھی ۱۰۰ کلو بوجھ اٹھا سکتا ہوں۔"

اس کی آواز میں درد کی چاشنی تھی مگر جوں ہی اس نے وزن اٹھانے کی کوشش کی اس کا حوصلہ یوں ٹوٹ گیا جیسے ایک ہلکے سے وزن سے کچا گدّا ٹوٹ جاتا ہے اور وہ لڑکھڑاتا رہا۔ لوگوں کے معنی خیز فقرے سن کر ان کے قہقہوں کو نظر انداز

کر کے اپنے چہرے پر شرارت بھری مسکراہٹ کا نقاب پہن کر وہ ڈاکٹر کے پاس بھی گیا۔

ڈاکٹر اس کے ننگے جسم کو دیکھ کر اس کی چھاتی ناپنے کی بجائے اس کی پسلیاں گنتا رہا۔

دوسرے آرزومند نوجوانوں کی طرح وہ بھی لمبے لمبے سانس لینے کی کوشش کرتا رہا مگر کھانسی اس کے سانسوں کو دبوچ کر اسے کرب و کراہت کا احساس دلاتی رہی۔

حوصلہ ٹوٹ گیا مگر امید کے گھوڑے نے سب سے بڑے افسر کی طرف رُخ کیا۔ اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر تنگ آکر اسے کمرے سے باہر نکال دیا، اس کی آواز گرجنے لگی۔

"فوج میں طاقتور آدمی چاہیئے۔ دشمن کا مقابلہ ہٹا کٹا آدمی ہی کر سکتا ہے۔ اور کوئی نوکری ڈھونڈ لو"

"صاحب نوکری نہیں ملتی۔ کام نہیں ملتا۔ ہم دس جماعت پڑھا ہے دوسرا آدمی ۸ جماعت پڑھا ہے۔ ہم کمزور ہے دُوسرا آدمی طاقتور ہے۔ اُسے ٹی۔بی نہیں ہے۔ وہ چار دن کا بھوکا نہیں ہے۔ وہ رات بھر سردی سے ٹھٹھر کر بیمار نہیں ہوتا ہے"

وہ سسک رہا تھا۔ گویا کسی سے فریاد کر رہا ہو۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ ایک کھوکھلے درخت سے مخاطب تھا جو خود بھی ہوا کے جھونکوں سے ملتے ہوئے سہارے کے لیے صدائیں دے رہا تھا۔ کئی رات فٹ پاتھ پر کروٹیں بدلتے اسے آج پھر وہی شخص ملا جو کئی سال سے گاہے بگاہے ملتا رہا تھا۔ . .

وہ کون ہے۔ کہاں سے آتا ہے۔ کیوں آتا ہے اور ان ہی دنوں میں کیوں آتا ہے یہ بھلا وہ کیسے جان لیتا۔ بڑے بڑے ہاتھ پر جب ایک چھوٹا سا لفافہ گرا دینے

کے دانوں پر یوں ٹوٹ پڑا جیسے وہ گرم گرم کباب تھے۔ چار دن کے بعد شکم میں چند دانے پڑتے ہی اسے چکر آنے لگا۔ مگر پھر بھی وہ اس شخص کی آواز صاف صاف سن رہا تھا۔

”واہ! —— مجھے اسی آدمی کی تلاش تھی۔ دھنسی دھنسی ہوئی آنکھیں پیلا چہرہ جسم گویا ہڈیوں کے ڈھانچے کو پلاسٹک بیگ میں ڈالا گیا ہو —— واہ! —— سردی سے ٹھٹھرتا، سسکتا ہوا آدمی۔ یقیناً دیکھنے والے کا کلیجہ پھٹ جائے گا۔“

”تو کیا۔ تو کیا۔ نو۔ کر۔ کری۔ ملے گی ——“ اس نے چنے چباتے ہوئے یوں کہا جیسے ایک خالی ٹیوب کو دبا دبا کر پیسٹ نکالنے کی کوشش کر رہا ہو۔

”ہاں —— ہاں!! —— آج سے تم میرے آدمی ہو —— تم کمزور نہیں بہت طاقتور ہو۔ اور میرے دشمن کو ہرا سکتے ہو۔“

یہ کہہ کر وہ اس سے نام پوچھ کر ووٹر لسٹ دیکھتا رہا۔ اور وہ چنے کھاتا رہا۔ اسے بہت بھوک لگی تھی۔!!

وِشوامِتر

جیپ کے ہارن نے وشوامتر کو چونکا دیا۔ اس کی گرفت ڈھیلی ہو گئی اور شانتی اس کی چنگل سے آزاد ہو کر فوراً سرسوتی ماں کے سینے سے لپٹ کر زار زار رونے لگی ——

وشوامتر کی آنکھیں دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح لال تھیں۔ اس کا چہرہ جو ایک پُرسکون جھیل کی طرح خاموش رہتا تھا، آج ایک سیلابی دریا کی طرح لمحہ بہ لمحہ کیفیت بدلتا رہا تھا۔ غصے سے وہ اپنا دماغی توازن اس حد تک کھو چکا تھا کہ اگر آنند آشرم کے احاطے میں پولیس کی جیپ داخل نہ ہوتی تو شاید اُس نے شانتی کا گلا دبا کر اُسے ختم کر دیا ہوتا۔

کھڑکی سے جھانک کر جب اُس نے جیپ سے اترتی ہوئی ایک عورت کو دیکھا تو

اُس کا قہر آلودہ غصہ یوں ٹھنڈا ہو گیا۔ جیسے ایک دہکتی ہوئی لال لال سلاخ کو پانی کے ٹب میں ڈال دیا گیا ہو۔

رُوپ متی۔ رُوپ متی!! اس کے ہونٹ تھر تھرانے لگے اور خوشی کے آنسو پونچھتے ہوئے وہ یوں دوڑنے لگا گویا ایک ہجوم میں کھوئے ہوئے بچے کو ایک ننھا سا چہرہ نظر آیا ہو۔

وہ عورت واقعی رُوپا تھی۔

رُوپا اچانک اپنے بیڈ رُوم سے غائب ہو گئی تھی اور وِشوامتر رات بھر اپنی روپ متی کو یوں تلاش کرتا رہا جیسے کوئی رشی مُنی خدا کو تلاش کر رہا ہو۔

"رُوپ متی تم کہاں ہو!" وہ رات بھر دیوانوں کی طرح چلاتا رہا اور مجنوں کی طرح چلتا رہا۔

رُوپ متی کہاں ہے؟ کس حال میں ہے۔ زندہ ہے یا مُردہ؟ جانے کتنے ہی ایسے سوالات تھے جو رات بھر اُس کے جذبات کو گھسیٹ کر جنون کی طرف لے جا رہے تھے۔ کبھی اُسے چلتے چلتے یوں محسوس ہوتا رہا جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ اور کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا رہا جیسے کوئی اس کے آگے آگے دوڑتا ہوا نکل رہا ہو اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ کبھی آہستہ آہستہ چلتا رہا جیسے دلدل میں پاؤں رکھے ہوئے چل رہا ہو۔ اور کبھی وہ یوں ایک سنسان سڑک پر دوڑتا رہا گویا ایک گھوڑا سوار بہت ہی تیز رفتار سے اپنے دشمن کا تعاقب کر رہا ہوں۔ مگر کون تھا اُس کا دشمن؟

اگر آج زندگی میں پہلی بار دُشمن کا عکس اس کے ذہن میں اُبھر کر اُسے اس قدر نہ ڈرا رہا ہوتا تو وہ پاگلوں جیسی حرکتیں کیوں کر کرتا۔ رُوپا شاید بہت دُور نکل گئی تھی۔ یا وہ کہیں آس پاس اَبدی نیند سو رہی تھی وہ رات بھر یہی سوچتا رہا۔ کبھی بار بار قدموں کی آہٹ جھاڑیوں کے پیچھے سنائی دینے والی سرگوشیاں یا دُور دور سے سُنائی دینے والی

صدائیں وہ جھوٹی تسلیاں ثابت ہوئی تھیں، جو اس کے شکستہ دل کو عارضی طور پر بہلاتے ہوئے اس کی آتما کو ٹھیس پہنچا رہی تھیں۔ اور وشوامتر نے اپنی انا کو اتنی بلندی پر پہنچایا تھا جہاں سے اُسے ساری دُنیا ایک فٹ بال نظر آ رہی تھی یعنی ٹھوکریں مار کر وہ دُنیا کا وجود ختم کر سکتا تھا یہ اس کا ارادہ نہ سہی مگر سوچ ضرور تھی۔ لیکن آج کے اس سانحہ نے اس کے وجود کو اس قدر کمزور بنا ڈالا تھا کہ عمر کی اُونچی اُونچی فصیلیں بھی ان آنسوؤں کو نہیں روک سکتی تھیں جو وہ غمِ فراق میں بہائے جا رہا تھا۔ رواں دواں گویا ایک ٹوٹے باندھ سے اُچھلتا پانی۔

رونے دھونے کو جذبات کی شدّتِ بیان کرنے والا مفکّر آج زندگی میں پہلی بار رو پڑا تھا فقط اس لیے کہ وصل کی شب ایک قصۂ فراق بن چکی تھی۔ یہ رات اُس کی سہاگ رات تھی۔ اور رُویا اپنی خواب گاہ سے یوں غائب ہو گئی تھی جیسے آسیب کا وجود۔

وِشوامتر شہر کا ایک مانا ہُوا دانش وَر ہی نہیں بلکہ ایک عظیم تخلیق کار بھی ہے، ایک نامور سنگ تراش۔ جس نے شہر سے دُور پہاڑیوں کی گود میں اپنی ایک الگ دُنیا بسا رکھی ہے۔ ایک ایسی دُنیا جس میں کسی کا دخل نہیں۔

ایک سفید رنگ کا مکان جس کے در و دیوار بھی سفید ہیں، پردے بھی سفید ہیں۔ فرنیچر سفید رنگ کا ہے۔ قالین سفید رنگ کے ہیں، فرش سفید رنگ کا ہے۔ اور جہاں ہر کمرے میں قدم قدم پر سنگِ مرمر کے مجسمے ہیں۔ ہر طرح کے مجسمے جنھیں وِشوامتر نے خود تراشا ہے جنھیں وشوامتر نے خود سنوارا ہے۔ جنھیں وشوامتر نے نام دیئے ہیں "روپ متی" "پھول متی" وغیرہ وغیرہ۔ اور وہ ان مجسموں کے ساتھ رہتا ہے۔ ان کے ساتھ گھنٹوں باتیں کرتا رہتا ہے۔ ان سے مشورے کرتا رہتا ہے۔ ان کو ہدایتیں دیتا ہے۔ ان کے ساتھ ہاتھ سے ہاتھ ملا کر ناچتا ہے۔ اور یوں وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت ان کے ساتھ گزارتا ہے۔ اوروں کے لیے

یہ پاگل پن سہی۔ گھر کے نوکروں کے لیے یہ جادو ٹونا یا رُوحانی کرشمات سہی مگر یہی وشوامتر کی دُنیا ہے۔ اُس کی اپنی بنائی ہوئی دُنیا ——— اپنے بسائے ہوئے لوگ کبھی کبھار اپنی سفید رنگ کی کار میں وہ شہر چلا بھی جاتا ہے۔ وہ بھی بقول اس کے وہ اپنے فیملی لوگوں کو تلاش کرنے یعنی پتھر کے ان ٹکڑوں کو جمع کرنے۔ جنہیں وہ تماش کما اور پھر نام دے کر کسی نہ کسی نئی تھیوری یا نئے فلسفے کے ساتھ وابستہ کر کے پریس کانفرنسیں دیتا رہتا ہے حالانکہ ان فلسفوں سے دُنیا اُوب گئی ہے۔ تصورات کی اس مصنوعی دُنیا سے اسے کھینچ کر باہر نکالنے کی کوشش کس نے نہیں کی تھی۔ رشتہ داروں نے، دوستوں نے، ہم عصروں نے، حسین دوشیزاؤں نے، مگر اس نے کسی کو قربت کا شرف تک نہیں بخشا تھا۔ جبھی وہ ایک تماشا بن چکا تھا۔ اور دُنیا تماشائی۔

ایسے ہی وشوامتر اپنی زندگی کے پچاس سال گزار چکا تھا۔ اور اب اس کے سفید لباس کا ساتھ اس کی سفید لمبی داڑھی اور لمبے لمبے سفید بال بھی دے رہے تھے۔ مگر یہ رشی منیوں کی طرح رہنے والا سنگتراش رُوپا کو دیکھتے ہی یوں بدل گیا تھا جیسے موسم۔

رُوپا کو وشوامتر نے پہلی بار آنند آشرم کے دروازے پر تب دیکھا تھا۔ جب وہ ساتھ بہتی ہوئی ندی سے ایک بڑا پتھر نکال رہا تھا۔ رُوپا کو دیکھتے ہی اُسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے کسی انجانی آرٹ گیلری میں اس نے اپنا ہی تراشا ہوا مجسمہ دیکھ لیا ہو پھر رُوپا سامنے سے نکل گئی تھی۔ وشوامتر کو یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ اپنی تخلیق کو انگلی پکڑ کر چلنا پھرنا سکھا رہا ہو۔

سیدھی سادھی سفید رنگ کی ساڑھی پہنے ہوئے اپنے جسم کے آدھے حصے کو گھونگھٹ سے ڈھانپ کر وہ واقعی چل رہی تھی جیسے ایک سنگ مرمر کا بُت خود بخود چلنے پھرنے لگا ہو۔ پہلی بار جب رُوپا نے معنی خیز نظروں سے ایک اجنبی کو دیکھا تھا۔

تو وہ سہم کر سرسوتی ماں کے کمرے میں چھپ گئی تھی۔ مگر دوسری ملاقات میں وشوامتر نے جانے کیسے اسے اپنائیت کا احساس دلایا تھا اور وہ تقریباً روز ہی آنند آشرم کے آہنی گیٹ سے جھانک جھانک کر وشوامتر کو یوں دیکھتی رہی جیسے جنت سے آئی ہوئی الپسرا کا مہارشی وشوامتر کی تپسیا بھنگ کرنے کی ترکیب سوچ رہی تھی اور پھر ایک دن وشوامتر نے ندی سے وہ پتھر نہیں نکالا اور وہ رُوپا کو رُوپ متی کا نام دے کر اُسے چاہنے لگا۔

اپنی رُوم پارٹنر اور بہت ہی پیاری سہیلی شانتی سے پل بھر بھی الگ نہ رہنے والی رُوپا بھی وشوامتر کے لیے بے معنی تھے۔ جبھی وہ گفتگو تو کیا اس میں دلچسپی لینے لگی۔ حالانکہ وشوامتر کے اس نرالے انتخاب سے بددل ہو کر شانتی کئی بار ان کے نزدیک آنے کی کوشش کرتی رہتی۔ مگر ماضی کا پری چہرہ و نازک بدن لیے اُسے پنے قریب بھی نہیں آنے دیتا تھا۔

مگر وشوامتر کے انتخاب نے اوروں کو بھی چونکا دیا تھا۔ پتھر کی طرح بے تاثر چہرہ، نیپالیوں کی طرح چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور جنگلی کی طرح اُبھرے ہوئے گال۔ موٹے موٹے ہونٹ بہت کم ہلتے تھے اور جب ہلتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے پھاٹک کھولی جا رہی ہو۔ ہر سوال کا جواب وہ "ہاں" یا "ناں" میں دیتی تھی۔ اتنا ہی نہیں، اس کو پولیس نے سڑکوں پر کئی رات گئی بار بھیک مانگتے ہوئے پکڑا تھا اور اس لیے آنند آشرم میں داخل کروایا گیا تھا۔ جب کہ شانتی ایک دیو داسی لڑکی تھی جسے سرسوتی ماں نے بچپن سے پالا پوسا تھا۔

سرسوتی ماں دل ہی دل میں رُوپا سے سخت نفرت کرتی تھی۔ جب کہ وہ شانتی سے بہت پیار کرتی تھی۔ گویا وہ گود لی ہوئی نہیں بلکہ اس کی بیٹی تھی مگر جب وشوامتر نے رُوپا کا ہاتھ مانگا تھا تب سرسوتی ماں نے شانتی کا ہاتھ ہی دیا چاہا تھا ——

سرسوتی ماں کی تجویز سنتے ہی وشوامتر پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہوگئی تھی جیسے ایک مہارشی شراب دینے لگا تھا۔

شادی طے ہوگئی تو روپا کی نظریں شرم سے جھک گئی تھیں جب کہ شانتی یوں بھڑک اٹھی تھی جیسے بھڑکتے ہوئے شعلوں پر پٹرول کے چھینٹے ڈال دیے گئے ہوں اس کی آنکھیں شیرنی کی طرح چمک اٹھی تھیں پھر لب تھرتھرا آئے تھے۔ اس نے وشوامتر کے قریب آکر کچھ کہہ بھی ڈالا تھا۔ مگر اس نے تو کیا کسی نے بھی اس کی دھیمی آواز نہیں سنی تھی۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے سسکیوں میں ڈوب گئی تھی۔ دونوں سہیلیوں نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تھا۔ تو شانتی اپنے بال نوچتی، چیختی چلاتی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ شادی ہوئی۔ مگر شادی کیا تھی۔ بس وشوامتر کی ضد۔ اس نے روپا کو کار میں بٹھا دیا۔ اور دونوں اک طرف چل پڑے تھے شانتی کمرے کی راہ پر قابو پاکر سفید کار کو تب تک دیکھتی رہی —— جب تک کار میں بیٹھے سفید پوش دولہا دلہن نظروں سے اوجھل نہ ہوئے۔

گاؤں میں ہنگامہ برپا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ غالباً یہ پہلا موقع تھا جب لوگوں نے دولہا دلہن کو سفید کپڑوں میں دیکھا تھا۔ انھیں پتھروں سے باتیں کرتے دیکھا تھا جو کچھ سمجھ رہے تھے وہ ہنس رہے تھے جو نا سمجھ تھے وہ حیران تھے کہ یہ سب کیا ہے۔ مگر وشوامتر کو دونوں میں سے کسی کی فکر نہ تھی جب فکر نہیں تو ذکر کس بات کا۔ شاید یہی سوچ کر وہ اپنے مجسموں سے معمول کی طرح پیار کرتا رہا جب کہ روپا اپنی خواب گاہ میں گئی رات تک وشوامتر کا انتظار کرتی رہی۔

آج اس کی سہاگ رات تھی۔ مگر وشوامتر کے لیے یہ رات مرادوں کی رات تھی۔ آج ایک عاشق اور معشوق کا ملن نہیں تھا۔ ایک تخلیق کار اور اس کی تخلیق کا آمنا سامنا

تھا۔ اُس کا تصور پتھر کی دیواروں سے آزاد ہو کر چلنے پھرنے لگا تھا۔ اور وہ اپنی کامیابی پر اتنا ہی خوش تھا۔ جتنا کروڑوں سال پہلے مہارشی وشوامتر اپنے اردگرد ایک نئی کائنات کو جنم دے کر مسرور تھا۔ مگر ——

اپنی کامیابی کا ڈنکا بجاتے ہوئے جب وشوامتر نے خوابگاہ کا دروازہ کھولا تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔

اس کی رُوپ متی غسل خانے میں بھی نہیں تھی۔

وہ مکان کے کسی کمرے میں بھی نہیں تھی۔ وہ احاطہ کے کسی کونے یا گاؤں کے کسی گوشے میں بھی نہیں تھی۔

یقیناً اُسے کوئی اغوا کر کے لے گیا تھا۔ اور ساتھ میں اس کی کار اور تمام پونجی بھی۔

مکان میں گویا ایک بھیانک زلزلہ آ گیا تھا۔ اور وہ لڑکھڑاتے ہوئے صدائیں دیتا رہا۔

اس کی تپسیا کسی راکھشس نے بھنگ کر دی تھی۔ اور زندگی میں پہلی بار ڈر ایک سوالیہ نشان بن کر اس کا تعاقب کرنے لگا تھا۔ لیکن پھر بھی اپنی انا کی اونچی اونچی دیواروں کے سہارے چل کر وہ رُوپا کی تلاش میں نکل پڑا۔ اور رات بھر چلتا رہا۔ . .
اس کا غصہ سیمابی کیفیت اختیار کر چکا تھا، اور چڑھتا ہوا پارہ بدخیالی کو جنم دے رہا تھا۔ انتقام غصہ کے شعلوں کو ہوائیں دیتا رہا اور جب بھی وہ دشمن کے بارے میں سوچتا تب یا تو شانتی کا چہرہ سامنے آتا یا پھر سوتی ماں کا۔ گویا دونوں چہرے بے نقاب ہو چکے تھے۔ اور دونوں کی ڈراؤنی شکلیں ڈائنوں سے ملتی جلتی نظر آ رہی تھیں۔

اور وہ دونوں کی تلاش میں آنند آشرم پہنچ گیا۔ دونوں کو ایک ہی کمرہ میں

دیکھتے ہی وہ اُن پریوں ٹوٹ پڑا تھا گویا اس نے ایک اُونچی عمارت کے اندر ٹائم بم رکھتے ہوئے دو مجرموں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ سرسوتی ماں کچھ کہتی شانتی کچھ سُناتی یا وشوامتر جواب طلب کرتا، ہارن کی آواز نے سب کو چونکا دیا تھا۔ اور اگر وشوامتر رُوپا کو دیکھتے ہی احاطے میں نہ چلا گیا ہوتا تو شاید کچھ بیان کرنے سے پہلے یا کچھ عیاں ہونے سے پہلے ہی سیلابی دریا ان کو اپنے ساتھ بہا کے چل دیا ہوتا۔

''رُوپ متی۔''

وشوامتر کو اپنا پیار بھی ملا تھا اور اپنا کھویا ہوا وشواس بھی تخلیق کی قربت اور تخلیق کا اعتماد بھی۔

مگر اچانک زبردست انکشاف ہوا۔

''وشوامتر صاحب! آپ کی رُوپ متی ایک پیشہ ور مجرم ہے جو ایک خطرناک جرائم پیشہ گروہ سے تعلق رکھتی ہے کبھی گھریلو نوکرانی، کبھی دھوبن، کبھی بھنگن، کبھی آیا کبھی دائی اور کبھی بھکارن بن کر وہ آس پاس کے شہروں میں کتنے ہی گھر لوٹ چکی ہے۔ آشرم میں پناہ لے کر وہ پچھلے چھ ماہ سے ہماری نظروں سے اوجھل رہنے میں کامیاب تو ہو گئی مگر آج پکڑی گئی۔ وہ بھی شاید اس لیے کہ کار میں پٹرول نہیں تھا ورنہ۔۔۔''

انسپکٹر شرما نے رُوپا کو نفرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ نہیں ایسا فریب ناممکن ہے۔ آپ کی آنکھیں دھوکا کھا گئی ہیں'' وشوامتر چلانے لگا۔

''دھوکا تو آپ کھا گئے ہیں رشی مہاراج۔ فقط اس لیے کہ پتھر کے آئینوں میں عکس دیکھنے کے آپ عادی ہو چکے ہیں، ہم نہیں۔ اپنے اردگرد خود ہی دُھند پھیلا کر اپنے تصوّر کے دُھندلے خاکے دیکھ دیکھ کر آپ اصلی چہروں کی پہچان نہیں کر پائے ہیں۔ ٹھنڈے پتھروں کو چھوڑ کر آپ حقیقت کی گرمی اور قدرت کی تپش کو محسوس کرنے کی عادت بھول گئے ہیں۔ آپ ایک مصنوعی دنیا میں رہتے ہیں۔ ایک ایسی دُنیا میں

جو ریت کے محلوں کی طرح ریزہ ریزہ بکھر کر آپ کی آنکھوں کو چبھنے لگی ہے جو موم کے محل کی طرح پگھل کر آپ کے ہاتھ پاؤں جلا رہی ہے۔

اس سے پہلے کہ وشوامتر انسپکٹر شرما کی تنقید کو چیلنج کرتا۔ شانتی ایک زخمی بلی کی طرح رُوپا پر ٹوٹ پڑی۔ اسی کشمکش میں رُوپا کے سینے کے اُبھار سے نوٹوں کے بنڈل نکلے۔ یکدم دھکم پیل میں اس کا مصنوعی نسوانی وقار بھی دسہرے کے راون کی طرح زمین پر گر گیا۔ اور ایک چھوٹے سے قد کے نیپالی کو دیکھ کر حاضرین سکتے میں آئے۔ "رُوپا! تم"۔ وشوامتر کی آنکھیں باہر آنے لگیں تو شانتی نے چیخ کر کہا۔

"رُوپا نہیں۔ رُوپ سنگھ ——— میرے ہونے والے بچے کا باپ!! مجھ پر ٹھونسا ہوا ایک پاپ جسے میں نے چھپانا نہیں چاہا تھا۔ مگر آپ دیکھ نہ سکے۔ آپ تو کیا دُنیا بھی اس غریب کو دیکھ نہ سکی۔"

یہ کہتے ہی وہ ایک زخمی کبوتر کی طرح زمین پر گر گئی اور سرسوتی ماں اپنے بچے کو کلیجے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دُوسروں کو گیان دینے والی خود کیسے انجان رہی۔ وہ یہ سوچتی رہی جبکہ رُوپا دانت پیستا ہُوا گالیاں بکتا ہُوا، بیڑی کے لمبے لمبے کش لگاتا ہوا خود ہی پولیس جیپ میں بیٹھ گیا۔ گویا یہ عارضی جنگ بندی تھی۔ رات کو جب معمول کے مطابق وشوامتر اپنے مکان میں داخل ہوا تو اپنے ہی تراشے ہوئے مجسموں کو دیکھ کر ڈرنے لگا۔

اس نے معمول کی طرح آج بھی باتیں کرنا چاہیں۔ مگر ہر قدم پہ اُسے یُوں محسوس ہوا۔ جیسے وہ اپنے ہی بنائے ہوئے جال میں پھنس گیا ہو۔ قہقہوں کی فاتحانہ آواز کی بجائے اُسے ہر طرف سے خوف کی آوازیں سُنائی دیں تو وہ اپنے آپ سے گھبرانے لگا غالباً ویسے ہی جیسے زہریلے بموں کے خالق اپنی تخلیق دیکھ کر کبھی کبھار محسوس کرتے ہوں گے۔

اچانک اُس نے تیشہ اُٹھایا اور رات بھر اپنے تراشے ہوئے تمام مجسمے توڑتا

رہا ————

سحر ہونے سے پہلے ہی وہ اپنی بنائی ہوئی دُنیا مسمار کر چکا تھا۔ صبح ہوتے ہی اُسے جس شدت سے تنہائی کا احساس ہونے لگا تو زندگی میں پہلی بار یوں محسوس ہوا جیسے وہ ایک گہری نیند سے بیدار ہو گیا ہو۔ اور تصوّر کے دُھندلے خاکوں کی بجائے اُسے اپنے رشتہ دار، دوست اور پڑوسی یاد آئے اور پھر اچانک شانتی یاد آئی۔ غالباً اس لیے کہ اُسے بدلے ہوئے حالات میں شانتی ہی کی ضرورت تھی۔

○○

دشرتھ

شیتل نے شیشوں سے جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی مگر برف کے گالوں کے علاوہ اُسے کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ حالانکہ جیپ کے اردگرد کھڑے لوگوں میں اس کی بوڑھی ماں بھی ہے۔

دشرتھ ناتھ بوڑھی کو تسلیاں دیے جا رہا تھا اور گاؤں والے کل یگ کے اس فرشتے کی جے جے کار کرتے رہے۔

زبردست برف باری اور کڑاکے کی سردی نے اگر گاؤں والوں کے جوش و خروش کو ٹھنڈا ہونے دیا ہوتا تب علی الصباح دشرتھ ناتھ کے صحن میں گاؤں کے تقریباً تمام زن و مرد ہرگز ہرگز نہ ہوتے۔ یہ لوگ اپنے محبوب محسن کو معمول کی طرح آج بھی وداع کرنے آئے ہیں اور دشرتھ ناتھ بھی ایک رحم دل بادشاہ کی طرح ان کے والہانہ

محبت سے متاثر ہو کر اپنے خلوص، انسان دوستی، غریب پروری کا بھرپور مظاہرہ کر رہا ہے —— سردی سے ٹھٹھرتی ہوئی کسی مریل سی خاتون کو اپنا کمبل دے کر، کسی ننگے بچّے کے جسم کو اپنے قیمتی شال سے اوڑھا کر، کسی بیمار کو دوائیوں کے لیے روپے دے کر، کسی طالب علم کو کاغذ و قلم دے کر، کسی بے روزگار کو روزگار دے کر۔ شاید اپنی اپنی مُرادوں کو پُورا ہوتے دیکھ کر گاؤں والے برف کے گالوں کو یوں دیکھ رہے ہیں جیسے خدا ایک فرشتے پر پھول برسا رہا ہو مگر شیتل کی کیفیت ان سب سے مختلف ہے۔

دُور دُور تک پھیلی ہوئی برف کی چادر، برف سے ڈھکے ہوئے گاؤں کے چھوٹے چھوٹے مکان، برف کے بوجھ سے جھکی ہوئی درختوں کی ٹہنیاں اور برف پوش پہاڑیاں دیکھ کر وہ یُوں سُکڑ جاتی ہے جیسے اس کے ارد گرد سفید سفید جن یا بھوت کھڑے ہوں۔

جیپ اسٹارٹ ہوتے ہی اگر وہ اپنے تھرتھراتے ہونٹوں کو شال سے نہ دباتی تو شاید ایک درد بھری چیخ ساری وادی میں گونج اُٹھتی۔ اس کی سسکیاں —— اگلی سیٹ پر بیٹھے دشرتھ ناتھ نے سُن لیں تو اس نے اپنی معنی خیز نگاہوں سے اس کے حوصلے کو سہارا دینا چاہا اور شیتل لمبے لمبے سانس لے کر مُنہ سے نکلتے بھاپ کو یوں دیکھتی رہی جیسے اس کے ارد گرد کہر پھیل رہی ہو۔

کہُر سے وہ بچپن میں بھی بہت ڈرتی تھی۔ شاید اس لیے کہ کہر میں وہ کئی بار اپنا راستہ بھول گئی تھی۔ مگر برف سے اسے بہت پیار تھا۔ جبھی تو وہ اکثر کانگڑی تاپتے ہوئے دہلیز پر بیٹھ کر بڑے اشتیاق سے برف پوش وادیوں کو دیکھتی رہتی۔ کبھی گرتی ہوئی برف دیکھتی رہتی اور کبھی اپنے مکان یا دُوسروں کے چھتوں سے لٹکتے ہوئے لمبے لمبے برف کے ٹکڑوں کو دیکھ کر ان چھونے کی یوں کوشش کرتی رہتی

جیسے کسی پہاڑی پر چڑھ کر آسمان پر ٹمٹماتے ہوئے ستاروں کو پکڑنا چاہتی ہو۔ مگر ناکام ہو کر وہ غصے سے، اپنی ماں سے پوچھا کرتی تھی۔ ماں! میں کب بڑی ہوں گی؟۔ مگر جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی وہ شیشے کے مانند برف کے ان ٹکڑوں کو دیکھ کر یوں محسوس کرتی جیسے وہ چھت سے لٹکتے ہوئے خنجر ہوں جو اسے لہولہان کرنے کی بار بار دھمکیاں دیے جا رہے ہوں۔ جبھی تو وہ برف کے تصوّر سے بھی کانپ اٹھتی ہے۔ یہ سب کسی وہم یا بد خیال کا عکس نہیں ہے بلکہ ایک ٹھوس سوچ کا پیش خیمہ ہے۔

برفیلی راتوں میں اکثر، جب شیتل کی نیند کھُل جاتی ہے۔ تب خاموشی کو چیرتی ہوئی سُوں سُوں کی آواز سُن کر اُسے کسی کی آمد کا احساس ہوتا ہے۔ پھر کچھ گھبرا کر کچھ شرما کر وہ کھڑکی کی جالیوں پر لگے کاغذ میں اُنگلی سے چھید کر کے تاریکیوں میں یوں جھانک کر دیکھتی ہے۔ جیسے برآمدے میں یا صحن میں کوئی ٹہل رہا ہو یا کمرے کے اندر آنے کی اجازت مانگ رہا ہو۔ یا اُس سے لپٹ جانے کے لیے صدائیں دیے جا رہا ہو۔۔۔۔ مگر؟ اگلے ہی لمحے جب اسے اپنی نادانی کا احساس ہوتا۔۔۔ تب اُسے یوں محسوس ہوتا۔۔۔ جیسے اس کے ٹھٹھرتے ہوئے ہاتھوں کی کمزور گرفت سے ایک سہارا نکل گیا ہو اور وہ برف کی گہرائیوں میں دھنس گیا ہو۔

جب کبھی شیتل پر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے تب وہ یا تو بلک بلک کر رو کر اپنے بھیگے سرہانے کو دیکھتی رہتی ہے۔ یا پھر وہ اپنے لبوں سی کر چپ چاپ جلاتی رہتی ہے۔ جھوں جھوں کی آواز جب اُس کی سسکیوں کے ساتھ اس کے احساسات پر حاوی ہو جاتی ہے تب اُسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک بیل گاڑی میں بیٹھی دلہن اپنے پیا کے گھر جا رہی ہو یا پھر وہ اپنے پتی پرمیشور کے گھر سے اپنا پہلا بچہ گود میں لے کر پہلی بار اپنی ماں کے پاس آئی ہو۔

کیسی دُلہن، کیسا بچہ، یہ خیال جب اس کے احساسات کا سلسلہ توڑ دیتا ہے

تب وہ اپنے جذبات پر قابو پانے کے لیے رامائن کا پاٹھ کرتی رہتی ہے۔

کل بھی وہ رامائن ہی پڑھ رہی تھی۔ ایک آوارہ ہوا کا جھونکا جب اس کے بالوں سے ٹکرا گیا تب اسے ایک خیال نے چونکا دیا۔ ۔ ۔ رانی کیکئی نے راجہ دشرتھ کی جان بچا کر منہ مانگا انعام مانگا تھا۔ شیتل نے بھی دس سال پہلے دشرتھ کی جان بچالی تھی۔ تو پھر؟ ایک آرزو نے جب ایک منصوبے کی شکل اختیار کی تب شیتل کا ارادہ ایک ٹھوس عمل کا زرہ بکتر پہن کر دشرتھ ناتھ کا انتظار کرتا رہا۔

یہ کل رات کی بات تھی۔

معمول کی طرح شیتل نے دشرتھ ناتھ کے کمرے کی صفائی کی۔ بیڈ روم میں اگر بتیاں جلائیں۔ آتش دان میں لکڑی سجا کر یوں آگ جلائی جیسے لگن منڈپ میں گھی کی آہوتی دی جا رہی ہو۔ قالین کے نرم و نازک ریشوں کو برش سے صاف کرتے ہوئے اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی مہربان نے دولہا دلہن کا سواگت کرنے کی خاطر فرش پر رنگولی سجادی ہو۔ اس نے وارڈ روب کا دروازہ کھول کر جب رنگے برنگے کپڑوں کو چھو لیا تو اسے زندگی میں پہلی بار ایک خوبصورت لمس کا احساس ہوا۔ گویا پیاسے ہونٹ چشمے کو چھو رہے ہوں۔ آج یہ چمکیلے زرق برق کپڑے اسے بہت اچھے لگ رہے تھے۔ آج پہلی بار اس نے بنی ٹھنی سے وہ صندوق کھولا جس میں زیورات تھے۔ طرح طرح کے سینٹ، پاؤڈر کریم، لپ اسٹک وغیرہ یوں پڑے تھے جیسے زمین کے نیچے دبے ایک خزانے کے انمول موتی۔ ایک دیہاتی لڑکی کا ان سے کیا کام ہو سکتا ہے، مگر آج وہ وجد میں آ گئی۔ سنگھار بھی کرنا چاہتی تھی اور وہ نرم و نازک پشمینے کا سوٹ بھی پہننا چاہتی تھی جو اس کے گورے گورے جسم کو چھو لینے کی کوشش یوں کیے جا رہا تھا جیسے ایک بھنورا ایک نازک پھول کو چومنے کی کوشش کیے جا رہا ہو۔

سوٹ پہن کر اپنے شانوں پر پھیلے گیسوؤں کی مہک دیکھ کر وہ یوں جھومتی رہی جیسے ہوا کے جھونکوں سے سورج مکھی کا پھول۔

شیتل اس محل نما مکان کے مرحوم چوکیدار کی بیٹی ہے ۔ یہ واقعی دشرتھ ناتھ کا بڑا پن تھا کہ اس نے ایک نیا چوکیدار رکھنے کی بجائے اپنی لاکھوں کی جائیداد کی دیکھ بھال کے لیے مرحوم کی بیوہ کلرہی انتخاب کیا تھا۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو بھلا ان کا چولہا کیسے جلتا۔ غریبی کے عتاب نے ماں بیٹی کو کب کا کچل ڈالا ہوتا ورنہ . . .

ضرورت مندوں کی بے لوث خدمت کرنا دشرتھ ناتھ اپنا اولین فرض سمجھتا ہے، گاؤں کا وہ کون سا گھر ہے جہاں دشرتھ ناتھ کے احسانوں کا ذکر نہیں ہے۔ اگر کسی مکان کی چھت پھوس کی بجائے ٹین کی ہے تو دشرتھ ناتھ کی بدولت۔ گاؤں میں اگر کسی کے پاس ولایتی مرغیاں ہیں تو دشرتھ ناتھ کی نوازش ہے۔ اور تو اور گاؤں کی تقریباً ۵۰ فی صد لڑکیوں کا بیاہ بھی دشرتھ ناتھ نے ہی کروایا ہے۔

دشرتھ ناتھ اس گاؤں کا رہنے والا نہیں ہے۔ مگر پچھلے دس سال سے جنگلات کا یہ بہت بڑا ٹھیکیدار برف پوش وادیوں کی گود میں واقع اس چھوٹے سے گاؤں کو اپنے شہر سے بھی زیادہ چاہتا ہے۔ یہاں کے لوگوں کو دل و جان سے چاہتا ہے۔ گاؤں والے بھی اس فرشتے کے قدموں کی آہٹ کو خوشی کا پیغام سمجھتے ہیں، جب بھی دشرتھ ناتھ گاؤں میں چلا آتا ہے گھر گھر میں چراغاں ہوتا ہے۔ تب دیواروں کے جھنڈ میں روپوش یہ گاؤں دور دور سے یوں نظر آتا ہے جیسے جنت سے اتری پریاں طرح طرح کے ہیکر پہن کر رقص کر رہی ہوں۔ اسی دن ان لوگوں کی دیوالی ہوتی ہے۔

دشرتھ ناتھ جب پہلی بار اس گاؤں میں آیا تھا تب تقریباً ۳ میل کا دشوار گزار پیدل سفر کرنا پڑتا تھا۔ وہ جنگلات کا ٹھیکے دار ضرور تھا مگر اپنے کاروبار سے زیادہ دلچسپی وہ شکار کھیلنے میں لیتا تھا۔ دن بھر کندھے پر بندوق رکھ کر ادھر ادھر گھومتے پھرتے تقریباً ۴۰ سال کے شخص کو ایک روز شیتل کے باپ نے، بخار کی شدت سے تڑپتے ہوئے دیکھا تھا۔

اس روز بھی زبردست برف باری ہو رہی تھی۔

اس کا بس چلتا تو ایک شہری بابو کو ہرگز ہرگز اپنے گھر نہیں لے آتا مگر یہ شیتل کی ہی ضد تھی کہ دشرتھ ناتھ ان کے گھر میں تقریباً ڈیڑھ ماہ رہا۔

تب شیتل کی عمر بمشکل سولہ سال تھی۔

دشرتھ ناتھ کو نمونیا ہو گیا تھا اور وہ درد سے تڑپ کر کبھی چپکے چپکے آنسو بھی بہا لیا کرتا تھا اور ان آنسوؤں کو فقط شیتل ہی دیکھا کرتی تھی۔ کبھی دشرتھ کی بھیگی آنکھیں دیکھ کر اور کبھی بھیگے سرہانے کو چھو کر۔

یہ لمحات دشرتھ ناتھ کو یاد تھے اس لیے وہ گاؤں والوں کو بہت چاہتا ہے جب بھی وہ شکار پر جاتا ہے تو سارا گاؤں اس کے ساتھ یوں چلتا ہے جیسے ایک شہنشاہ کے ساتھ حفاظتی دستے۔ دشرتھ ناتھ اس گاؤں کا ہی نہیں بلکہ سارے پہاڑی علاقے کا بے تاج بادشاہ ہے۔ اور یہ گاؤں گویا اس کی راجدھانی ہے۔ اس کے دیوان خانے میں یوں دربار لگا رہتا ہے جیسے مغلِ اعظم کا دیوان۔

"ماں کو مویشی کے ساتھ رہ کر دق ہو گئی سیٹھ جی۔"

"میرے مکان کی چھت اُڑ گئی اَن داتا۔"

"دو دن سے بھوکا ہوں غریب پرور۔"

"بس ایک بیلوں کی جوڑی مِل جائے تو سخی داتا۔"

دشرتھ ناتھ واقعی لوگوں کی مُرادیں پوری کرتا ہے کسی کو ٹھیس نہیں پہنچاتا ہے۔ لیکن شیتل نے کبھی دشرتھ ناتھ سے کچھ نہیں مانگا تھا اور اگر وہ مانگ لے تو دشرتھ ناتھ 'نہ' کیسے کر سکے گا۔ شیتل نے اس کی جان بچائی تھی اس کا ذکر وہ خود کرتا رہتا ہے۔

سفید سفید چادر کو بار بار پلنگ پر بچھاتے ہوئے شیتل کو بار بار ایک

میلی کچیلی چادر کے دھندلے عکس نظر آتے رہے۔ میلی کچیلی چادر پر لیٹے ایک بیمار کا عکس نظر آیا۔ پھر اچانک کھانسی کی کھن کھن کی آواز کمرے میں سُنائی دی تو شیتل کو کسی کے قدموں کی آہٹ کا احساس ہوا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ شرما کر پلنگ پر بیٹھ جاتی، ایک دردناک چیخ نے اُسے چونکا دیا۔ گویا خون کے پیاسے ایک شیر نے ایک بکری کو دبوچ لیا ہو۔ یہ خوف اس کے وہم کا عکس تھا۔ اپنی کیفیت پر قابو پا کر ایک بار پھر سفید چادر کو یوں چھو لیا جیسے اس نے پہلی بار دشرتھ ناتھ کے سینے پر دس سال پہلے گرم گرم تیل کی مالش کی تھی۔ اُس روز وہ ہر سانس لیتے ہوئے یوں محسوس کر رہا تھا جیسے یہی آخری سانس ہے۔ مگر رفتہ رفتہ تکلیف وہ سانسوں کی تعداد کم ہوتی گئی۔

ایک طرف بھینس اور دُوسری طرف چولھا اور بیچ میں ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر لیٹا ہوا دشرتھ ناتھ کبھی کبھی اپنی اس حالت پر رو پڑتا تھا۔ مگر چولھے سے اُٹھتا ہوا دُھواں جب کبھی باہر نکلنے کی بجائے اس کے ارد گرد دھند کی مانند پھیل جاتا تب وہ دونوں یوں کھانستے رہتے تھے جیسے دو بڑے موسیقاروں کی جُگل بندی پھر دونوں ہنس پڑتے۔ اپنی دُکھتی ہوئی آنکھوں کو بھاری پلکوں سے سہلاتے ہوئے جب بھی دشرتھ ناتھ شیتل کا چہرہ دیکھ لیتا تھا تب اُسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ایک شہزادی بھیس بدل کر پرجا کی دیکھ بھال کر رہی ہو۔

دشرتھ ناتھ واپس چلا گیا تو شیتل اکثر کھوئی کھوئی سی دہلیز پر بیٹھی آسمان سے گرتے ہوئے برف کے گالوں کو یوں دیکھتی رہی جیسے کاغذ کے پُرزے پیغام لے کر آئے ہوں۔ اور پھر ایک روز پیغام نہیں بلکہ دشرتھ ناتھ خود چلا آیا۔ وہ گاؤں کے بچے بچے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لے آیا تھا۔ کپڑے، پھل، آٹا، چاول چھاتے وغیرہ۔ اس روز ایک فرشتے کی شناخت ہو گئی تھی۔ دشرتھ ناتھ تمام

گاؤں والوں کا محسن بن گیا۔

"مگر دشرتھ کی جان تو مَیں نے بچائی تھی!"

شیتل قالین کے ریشوں کو کھرچتی رہی اور بڑبڑاتی رہی۔ الماری سے ایک لال رنگ کا جوڑا نکال کر جونہی اس نے پہنا تو ایک بھیانک آواز نے اسے چونکا دیا۔ شاید برف کا ایک بہت بڑا تودہ ڈھلوان سے پھسلتا ہُوا گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ کرکری آواز سُن کر وہ کانپنے لگی لیکن جب سُوں سُوں کی آواز پھر نمایاں طور پر سنائی دی تب شیتل نے اپنے بالوں میں لال رنگ کے ربن باندھ لیے اور ہلکے ہلکے سُروں میں کوئی پہاڑی گیت گنگناتی رہی۔

گئی رات جب دشرتھ ناتھ اپنے کمرے میں چلا آیا تو شیتل کو دیکھ کر یوں چونک پڑا جیسے غلطی سے کسی انجان کمرے میں داخل ہوا ہو۔

شیتل دشرتھ ناتھ کے پلنگ پر بے فکری سے سوئی پڑی تھی۔ دشرتھ ناتھ کی گرجدار آواز نے اسے چونکا دیا تو اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہی اس نے نہایت نرم و نازک لہجے میں پوچھا۔ "مَیں نے آپ کی جان بچائی تھی نا۔"

"ہاں۔"

"رانی کیکئی نے بھی راجہ دشرتھ کی جان بچائی تھی۔" شیتل کی آواز میں اپنائیت کی چاشنی بھی تھی اور کسی چھپی خواہش کا رس بھی۔

"تم بھی مانگ لو کیا چاہیے تمھیں۔" دشرتھ شیتل کی سوالیہ نگاہوں کو دیکھ چکا تھا۔

"جو مانگ لوں وہ ملے گا؟"

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں ——— یہ کپڑے، یہ زیور، یہ مکان، یہ جنگل، یہ دولت۔"

"لیکن میں رانی کیکئی نہیں جو راج پاٹ مانگ لوں۔ مجھے گھر چاہئیے مکان نہیں۔ سکون چاہئیے شہرت نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تمھاری شادی ایک ایسے شخص سے کروا دوں گا۔ جسے میں مالا مال کر کے راج کمار بنا دوں گا۔ مسرتوں سے بھری زندگی کی جھیل میں تم ایک بطخ کی طرح تیرتی نظر آؤ گی۔"

"مجھے راجکمار قبول نہیں۔ میرے ہونے والے بچے کو آپ اپنا جانشین نہ سہی اپنا بیٹا تو کہہ دیں۔"

یہ سن کر دشرتھ نے شیتل کو دھکیل کر جب غصّے سے سگریٹ پاؤں کے نیچے مسل دیا۔ تب شیتل کو یوں محسوس ہوا جیسے قالین پر ایک ادھ جلی لاش پڑی ہے۔ دشرتھ ناتھ کی آنکھیں غصّے سے لال ہو گئی تھیں۔

"میں راجہ دشرتھ نہیں جو کیکئی کے کہنے پر اپنے گھر کو آگ لگا دوں۔"

دشرتھ ناتھ نے شیتل کو لال جوڑا اُتارنے کا حکم دیا۔ اس کی جبیں پر لگا ہوا تلک خود صاف کر کے شیتل کو وہی لباس پہننے کے لیے کہا جو اس نے کل رات پہنا تھا۔

معمول کی طرح رات کے تیسرے پہر جب شیتل دشرتھ کے پلنگ سے نیچے اُتر کر قالین پر لیٹ گئی تب اسے دشرتھ یوں نظر آیا جیسے آسمان پر چمکتے ہوئے تارے۔

"شیتل تم ایک عورت ہو۔ رانی کیکئی بھی عورت تھی۔ دشرتھ سے اپنا حق چھین کے لو۔ بغاوت کا نعرہ لگاؤ۔" شیتل کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کھڑکیوں سے جھانک جھانک کر اندر دیکھنے والی کئی دیہاتی لڑکیاں چلّا چلّا کر کہہ رہی ہوں۔

اُس نے کھڑکی کھولی تو باہر زبردست برف باری ہو رہی تھی۔ سردی کی ایک چبھتی ہوئی لہر نے دشرتھ ناتھ کی نیند خراب کی وہ غصّے سے بڑبڑانے لگا مگر شیتل سِسک سِسک کر پوچھتی رہی۔

"میں نے آپ کی زندگی بچائی تھی۔ آپ کیوں میرے بچے کو مار ڈالنا چاہتے ہو؟"

"میں راجہ دشرتھ نہیں جو بھرت کو پیدا ہونے دوں گا۔ کل تمھیں میرے ساتھ شہر جانا ہوگا ... سمجھیں؟"

"نہیں اس بار نہیں۔ اس بار نہیں۔"

شیتل سسکتی رہی اور دشرتھ کے خراٹے کمرے میں گونجتے رہے۔

جیپ بہت آگے نکل چکی تو برف کی چادر پر پہیوں کے نشان دیکھ کر گاؤں کے سرپنچ نے شیتل کی ماں کو تسلیاں دیتے ہوئے پوچھا۔

"بوڑھی اماں شیتل کو کب سے انتڑیوں کی بیماری لگی ہے؟"

بوڑھی نے اپنی چھاتی پیٹتے ہوئے فوراً کہا۔

"پچھلے نو سال سے بیٹے!"

○○

ھمدرد

دوارکاناتھ کول پاگل ہوگیا ——— یہ خبر آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی۔ اس لیے نہیں کہ کول صاحب کی شخصیت بہت اہم ہے بلکہ اس لیے کہ اُن کی پُرخلوص بیوی رُوپا کا ذکر تقریباً ہر گھر میں ہوتا رہتا ہے۔

رُوپا جی شہر کی ایک مقبول ترین عورت ہے۔ خاص طور پر مڈل کلاس کی عورتیں اُن کی بہت عزت کرتی ہیں اور احترام سے اُن کو موسی کہتی ہیں۔ اور موسی بھی سب سے اتنا پیار کرتی ہے گویا سارے شہر کی لڑکیاں اُس کے ہی بطن سے پیدا ہوئی ہوں۔ تبھی تو دیکھتے ہی دیکھتے کول ولا کے احاطے میں چہروں کا جنگل تھا اور بیچ میں بیٹھی رُوپا جی اپنے تھرتھراتے ہونٹ سی کر آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔ اپنی مُرجھائی ہوئی آنکھوں سے صدمہ برداشت کرنے کا یقین دلاتے ہوئے بھی اپنے رنج وغم کی شدت عیاں کر رہی تھی۔ گھر کی ہونے والی

تباہی بیان کر رہی تھی۔ کول صاحب کے بارے میں سبھی کہتے رہے کہ ایک دن پہلے وہ بالکل تندرست تھے، مگر اچانک وہ اپنا دماغی توازن کھو کر وحشیانہ حرکتیں کرنے لگے۔ اُن کی پہلی شکار بیچاری رُوپا جی ہی تھیں۔ اب کول صاحب کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی گئی مگر چونکہ وہ زبان کے ساتھ ہاتھ پاؤں بھی چلانے لگے تھے۔ اس لیے ڈاکٹر ورما کے مشورے پر اُن کو ایک ایسے کمرے میں بند کر دیا گیا تھا جہاں مکمل اندھیرا تھا۔ اس کمرے میں احتیاطاً بجلی کا کنکشن کاٹا گیا تھا۔ کمرے سے اور چیزوں کے علاوہ چارپائی تک باہر نکال لی گئی تھی۔ در و دیوار مکمل طور پر بند کیے گئے تھے۔ اور کول صاحب یوں چلا رہے تھے جیسے ایک شیر کو پہلی بار پنجرے میں قید کیا گیا ہو۔ وہ کیا کہہ رہے تھے اس کا مفہوم کوئی سمجھتا بھی تو کیسے؟ کبھی وہ نہایت مہذب طریقے سے درد بھری آواز میں بچاؤ کے لیے صدائیں دیتا تھا۔ کبھی خلافِ توقع بیوی بچوں بلکہ محلے داروں، رشتے داروں کو گالیاں دیتا تھا۔ کبھی کسی حادثے یا واقعے کا حوالہ یا ذکر کبھی اوٹ پٹانگ موڑ، کلام میں طرح طرح سے موڑ دے کر وہ کسی بھی جملے کو پورا کرنے کی بجائے در و دیوار کو توڑنے کی کوشش کرتے ہوئے نہایت گھٹیا مکالمے بول کر سب کو چونکا دیتا تھا ـــــــ اپنے بارے میں فحش الفاظ سُن کر رُوپا جی نظریں جھکا کر جب آہیں بھرتیں، تب اِرد گرد بیٹھی عورتیں کبھی اس کو سنگترے کا جوس پلاتی رہتی تھیں کبھی ٹھنڈا پانی۔ کبھی آہیں بھر کر رُوپا جی کے شکستہ دل کو تھپکیاں دینے کے لیے خود بھی رو پڑتیں۔ یا دانتوں تلے زبان دبا کر نہایت رنج و غم کا احساس دلاتے ہوئے سسکیوں و ہچکیوں کی جُگل بندی کے ساتھ ساتھ سرگوشیانہ انداز میں ساتھ بیٹھی عورت سے کہتیں۔ ہائے اب کیا ہو گا رُوپا جی کا ـــــــ کیا یہ قہرِ خدا ایسی نیک خاتون پر ہی ہونا تھا۔ دُوسروں کے غم میں شریک ہونے والی اس زاہدہ کو کیا خدا معاف نہیں کر سکتا تھا ـــــــ کیا یہ موسی کے صبر کا امتحان ہے یا اُس کی پُر سکون و خوش حال زندگی میں المیہ کی پہلی دراڑ ـــــــ

رُودیا اُن کی باتیں بغور سُن رہی تھیں اور اپنی عجیب و غریب حرکتوں سے یوں احساس دلا رہی تھیں جیسے برف کے بوجھ سے ایک سوکھی ٹہنی ٹوٹنے لگی ہو۔ اپنی ہمدرد دوست وره نما کو اس حالت میں دیکھ کر تقریباً ہر آنکھ بھیگ گئی تھی۔ رُودیا باجی کو سبھی نے ہمیشہ مسکراتے دیکھا تھا۔ ہنستے دیکھا تھا۔ ہاہا قہقہے لگاتے دیکھا تھا مگر ایک خزاں آلودہ درخت کی طرح مایوس کبھی نہیں دیکھا تھا۔

رُودیا باجی کی عمر یوں تو ۵۰ (پچاس) سال سے کچھ اُوپر ہو گی مگر وہ اپنے صاف ستھرے عادات کی وجہ سے مشکل سے ۳۵ سال کی نظر آتی ہیں۔ خوش باش گول چہرہ، موٹی موٹی آنکھیں جن میں انسان دوستی، دردمندی، غریب پروری کا پیغام ہے۔ ماتھے پر ایک بڑا سا تلک اور بدن پر اچھے اچھے کپڑے پہننے والی موسی آج مایوسی کے کیچڑ میں غوطے لگا کر بالکل بدلی بدلی سی نظر آتی تھیں۔ ایک منٹ بھی چُپ نہ رہنے والی، عورتوں کو نصیحتیں دینے والی شادی بیاہ پر رائے دینے والی رُودیا باجی یا موسی آج یوں چپ تھیں جیسے کسی نے ہونٹ سی دیے ہوں۔ ورنہ جب بھی دو چار عورتیں اُسے سرِ راہ چلتے چلتے، مندر جاتے جاتے سبزی خریدتے ہوئے اون، کپڑے، شال، سونا، زیور وغیرہ خریدتے ہوئے مل جاتیں تو وہ فوراً بول پڑتی۔

"اری او کملا ———— تیرا مرد تو بے وقوف ہے۔ تیرا کیا آج کل کے مردوں کی نسل ہی کم عقل ہے۔ تو بھلا سوچ۔ آج تیری بیٹی ۳ سال کی ہے۔ کل چار سال کی ہو جائے گی اور دیکھتے دیکھتے ۲۰ سال کی ہو جائے گی۔ لڑکی پرایا دھن ہے۔ لیکن ساتھ دھن نہیں دو گی تو ———— ؟ لے یہ جھمکے خرید۔ رکھ لینا ———— کام آئیں گے ———— میں پیسے دوں گی۔ مجھے بعد میں لوٹانا۔ ارے مان جا اپنی موسی کی بات پگلی ———— !"

دوسرا تم بات سمجھنے کی کوشش تو کرو۔ سونا دن بہ دن مہنگا ہوتا جا رہا ہے۔ اور

میں حیران ہوں کہ تم نے اپنی لڑکیوں کے لیے دس تولے بھی نہیں خرید کے رکھا؟"

" پدمنی ——— ! آشا ۱۵ سال کی ہوگئی اور تم نے ایک بھی پشمینے کی شال نہیں خریدی ہے! چل میرے ساتھ۔ تھوڑے پیسے آج دے۔ باقی آہستہ آہستہ دے دینا۔ ارے پگلی دوکان دار میرا واقف ہے۔"

" ارے واہ۔ بہت پیاری بچی ہے تمھاری۔ اپنی بچی کے لیے راجکمار چاہیے تو آج سے ہی تیاریاں کرو۔ آج کل اسٹیل کچھ سستا ہے۔ دو چار سیٹ خرید کر رکھ لو۔"

" لے لینے دو بھائی صاحب یہ نیکلس! ——— مانتی ہوں مہنگا ہے مگر آج کا شوق کل کی ضرورت پوری کرے گا۔ پہلا ہی بچہ اگر لڑکی ہو تو پھر کیا کرو گے۔۔۔؟ ویسے آپ کیا اسی شہر میں رہتے ہیں؟"

" شاردا تم یہ کیا کہہ رہی ہو؟ مردوں سے ان چیزوں کے بارے میں کیوں پوچھنا ہے! اُن کا کام ہے کمانا اور ہمارا کام ہے اس کا صحیح استعمال کرنا! گھر عورتیں بناتی ہیں مرد تھوڑے ہی ——— ایسا ہے میں تمھیں قسطوں پر فرج دلا دوں گی۔"

" ارے پگلی! مرد عورت کا دیوانہ ہوتا ہے۔ مگر یہ مرد؟ اُف بھگوان ان کو عقل دے! آج کی بات کریں گے۔ کل کیا ہوگا اس کے بارے میں سوچتے ہی نہیں۔ ایسا کرو ہر روز جب تمھارے شوہر دوکان سے لوٹیں تو چپکے سے جیب میں سے تھوڑے تھوڑے روپے نکال کر اپنے پاس رکھ لو۔ ارے مجھے تو تم پر ترس آرہا ہے۔ چار لڑکیاں ہیں تمھاری ——— گھبرانا نہیں۔ میری چھ ہیں۔ چھ دیویاں۔"

" کہا تھا نا ——— ! ارے پگلی وہ چوری تھوڑے ہی تھی۔ جیب سے اگر تھوڑے تھوڑے روپے نکال کر اپنے پاس رکھ لیتی تو تمھارے شوہر کی فضول خرچی پر ہی اثر پڑتا نا؟ اف یہ کم عقل لوگ! مکان بنانا ہو، بچے کا منڈن ہو، لڑکی کی شادی ہو تو بس اُدھار کر او بھگتے رہتے ہیں۔ اپنا سر پیٹ پیٹ کر خود سسک سسک کر رو دیتے ہیں۔

اور بچّوں کو تڑپا تڑپا کر مارتے ہیں۔ پھر بے چاری ہندوستانی بیویاں تو روئی کے ڈھیر کی طرح جلتی رہتی ہیں۔ عمر ہوتی ہے ۲۵ سال اور نظر آتی ہیں ۵۰ سال کی ——— مگر یہ سب ان کی نادانی کا پھل ہے۔ مجھے دیکھو خوش رہتی ہوں۔"

رُو باجی کی سبق آموز باتیں جن کو راس آتی ہیں وہ اُس سے پوچھتی رہتی ہیں۔

"موسی۔ مینی کو آج اُس کی نند دیکھنے آئے گی۔ کیا تحفہ دوں؟ ساڑی، سونے کی انگوٹھی! نقدی ———؟

"موسی سگائی ہی تو ہے! کیا تین سیٹ سے کام نہیں چلے گا؟"

"ساس کے لیے آج کل دو سیٹ رکھے جاتے ہیں نا؟ وہی تو میں تین دن سے بک رہی ہوں ——— لیکن گڈّی کے ڈیڈی میری بات مان جائیں تب نا۔"

رُو باجی کی بات چند عورتوں کے لیے حرفِ آخر ہے۔ اور پھر رُو باجی بھی جب مشورہ دیتی ہیں تو فقط ہمدردی کا جذبہ دل میں رکھ کر ——— اپنے تجربہ کو مدِ نظر رکھ کر۔

"ہاں بہن تم نے ٹھیک ہی سُنا ہے۔ ارے سوچو تو ذرا آئی، اے، ایس لڑکا ہے۔ چار پانچ سال میں کمشنر بن جائے گا۔ پھر ایسے لڑکے کے لیے ٹی۔ وی فرج تو کچھ بھی نہیں ہے۔ تم بھی شیاما کے لیے فرج رکھ لو۔ ارے قرضے کے پودوں کو آبِ حیات سے سینچا گیا ہے۔ کون سی شادی قرضہ اُٹھائے بغیر طے پائی ہے۔ اور پھر جو کچھ بھی تم کرو گی ——— کس کے لیے؟ اپنی اولاد کے لیے نا؟ ارے یہ بچے تو دل کے ٹکڑے ہیں ہمارے! ——— چُپ شوبھا۔ لڑکیوں کی بات مت کر۔ میری چھ ہیں۔ بس خوش رہو۔ لڑکیاں خود ہی اپنا نصیب لے کر آتی ہیں۔ پونچھ لے یہ آنسو ——— تمھیں میری قسم۔ ———"

رُدّو باجی کی باقی لڑکیوں کی شادی ہو چکی ہے - اچھے اچھے گھرانوں میں - کوئی ڈاکٹر ہے، کوئی انجینئر، کوئی میجر ——— اور اپنی حکمتِ عملی کے ثمر آفریں نتائج کا حوالہ دے کر جب وہ فلک شگاف قہقہے لگاتی ہیں تو مُرجھائے ہوئے گملوں میں بھی جان آجاتی ہے - پیلے چہرے بشاشت سے سُرخ ہو جاتے ہیں - لیکن آج رُدّو باجی خود ہی ایک سوکھے پتّے کی طرح زرد ہیں!

"اب کیا ہوگا؟ نیلم کی شادی اگلے ہفتے طے ہو چکی ہے!"

"نیلم کون ——— ؟ اچھا رُدّو باجی کی چھوٹی لڑکی ——— مگر شادی کیوں رُک جائے گی بھلا - تقدیر خدا کو کون ٹال سکتا ہے بھلا - ہم نے تو ارتھی اور ڈولی ساتھ ساتھ نکلتے بھی دیکھی ہے۔"

"کیا معلوم! آج کل کے لوگ بہت کچھ دیکھ لیتے ہیں بہن، کیا وہ یہ نہیں جان جائیں گے کہ کول صاحب پاگل ہو چکے ہیں۔"

"شاید بے چارہ لڑکی کے بچھڑنے کے غم میں ——— ؟ تبھی تو کہتی ہوں کہ یہ فیملی پلاننگ بکواس ہے - ایک لڑکا بھی ہوتا تو شاید بوڑھے کو سہارا ملتا۔"

"سُنا ہے سگائی پر بہت کچھ دے گئی ہے موسی ——— اور کیوں نا دیتی - جو دوسروں کو مشورہ دے سکتی ہے کیا وہ خود . . ."

عورتیں رنج و غم میں ڈوب کر بھی سرگوشیانہ انداز میں باتیں کر رہی تھیں اور رُدّو باجی ان کی باتیں سُن رہی تھیں - کبھی اپنے ہونٹ کُتر کُتر کر اور کبھی اپنی آنکھیں پونچھ کر -

اچانک ایک دھماکہ ہوا ——— اور ہر چہرے پر تشویش کے عکس دکھائی دینے لگے - پولیس کی جیپ گیٹ پر رُک گئی - اور انسپکٹر خان چند سپاہی ڈاکٹر در کے ساتھ اندر داخل ہوا - اُن میں سے کسی نے بھی کسی کی سوالیہ

نگاہ کا جواب نہیں دیا۔ بلکہ انسپکٹر خان اور ڈاکٹر درآپس میں کچھ سنجیدہ گفتگو کرتے رہے۔ پھر ایک دوسرے کو فیصلہ کن اشارہ کرتے ہی انھوں نے دروازہ کھولا۔

پہلے تو دروازہ کا ناتھ کول ایک خونخوار وحشی درندے کی طرح اُن پر ٹوٹ پڑا۔ مگر اگلے ہی لمحے جب ڈاکٹر در نے کھڑکیاں کھول دیں تو کول صاحب انسپکٹر خان کے پاؤں پکڑ کر چلّانے لگا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو کا دریا بہہ رہا تھا۔

"مجھے بچاؤ۔ مجھے بچاؤ۔!!"

وہ ایک بچّے کی طرح بلک بلک کر رونے لگا مگر سپاہی اُسے زبردستی پکڑ کر جیپ کی طرف گھسیٹ کر لے گئے۔ آس پاس کھڑے دوستوں اور رشتے داروں نے بھی پولس کی مدد کی۔

"کیا کول صاحب کو پاگل خانے پہنچانے کے لیے پولیس کی ضرورت پڑی" کسی نے ڈاکٹر در سے پوچھا مگر ڈاکٹر در کچھ کہے بغیر وہاں سے چل پڑا۔

جیپ میں چڑھنے سے پہلے کول صاحب نے بہت احتجاج کیا لیکن جب کسی نے اُس کی بات نہیں سُنی تو وہ یوں چیخنے لگا جیسے اُس کو کال کوٹھری میں لے جایا جا رہا تھا۔

"نیلم کی ماں! ——— روپا ——— بھری ہوگئی ہو کیا! یہ دیکھ مجھے پولس پکڑ کر لے جا رہی ہے! یہ لوگ مجھے بیڑیوں میں جکڑ دیں گے ——— ! رُوپا ——— ! مجھ پر ترس کھاؤ! میرا بیگ لوٹا دو رُوپا!! میرا یقین کرو رُوپا ——— بیگ میں سرکاری رقم ہے ——— روپا ——— !!"

رُوپا کھڑی ہوگئی تو ایک عورت نے دلاسہ دیتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"کس کی باتیں سُن رہی ہو موسی! دیوانے کی؟ کول صاحب ہوش و حواس میں ہوتے تو پوجا پاٹھ کرنے والا یہ بزرگ کیا ایسے چلّاتا۔ گالیاں دیتا۔ اپنے چہرے و جسم کو اپنے ہی ناخن سے کھرچ کھرچ کر لہو لہان کر دیتا۔ اپنی پگڑی کو خود ہی سب کے

سامنے تار تار کر دیتا۔"

رُوپا کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اُس کے ہونٹ ہلتے رہے۔ بات ہو نہیں سکی جیب چلی گئی۔ رُوپا ایک بُت کی طرح ٹکٹکی لگائے گیٹ پر ہر آتے جاتے شخص کو دیکھتی رہی۔ اپنے شوہر کی آواز اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ایک ایک کر کے جب گھر آئے سبھی دوست، رشتے دار، محلے دار چلے گئے تب ایک جانی پہچانی آواز نے رُوپا جی کو چونکا دیا۔

"میں بہت پہلے آ چکا تھا ——— مگر ——— ہنگامہ دیکھ کر شاید چلا بھی گیا ہوتا مگر یہ سوچ کر کہ نیلم جی کی شادی اگلے ہفتے مقرر ہو چکی ہے۔ میں انتظار کرتا رہا۔ دل بڑا دُکھی ہوا ——— خیر اسی کا نام ہے زندگی ——— یہ دیکھیے آپ کی خیر لایا ہوں۔ اور یہ دو سو روپے جو بچ گئے ہیں ——— ایک بات پوچھوں موسی! کیا کول صاحب کو اس قسم کے دورے پہلے بھی کبھی پڑ چکے ہیں۔"

رُوپا جی نے ایک چھوٹا سا بکس شال کے نیچے دبوچ کر آہستہ سے کہا۔

"نہیں ورما جی۔ آج پہلی بار ایسا ہوا ——— جانے کیوں؟" اور رُوپا جی آہ بھر کر بالکل نیا خریدا ہوا ڈائمنڈ سیٹ دکھانے کے لیے اُوپر والے کمرے میں چلی گئی۔ جہاں نیلم اپنے بوڑھے باپ کے انجام پر بے تحاشا رو رہی تھی۔ سرہانے کا سفید کور آنسوؤں سے یوں داغدار ہو چکا تھا جیسے رنگ برنگی کیاری کے اُوپر برسات کا پانی بہہ چکا ہو۔ اور رُوپا جی کو اپنی بیٹی کی نادانی اور جذبات کی شدت دیکھ کر غصّہ آ رہا تھا۔

فرض کا کفن

ٹیلی فون کی گھنٹی نے دیپک کو ایسے چونکا دیا جیسے تاریک رات میں تنہا راہ گزار کو للکارتی ہوئی ڈراؤنی آواز!

اس نے نیم خوف زدہ ہو کر ٹیلی فون کو ایسے دیکھا جیسے وہ چلّا چلّا کر کوئی راز فاش کرنے کی دھمکیاں دے رہا ہو۔ کانپتے ہوئے ہاتھ سے اس نے ریسیور اٹھایا اور پھر ایک دم چھوڑ دیا جیسے اس کی گرفت میں غلطی سے ایک زہریلا ناگ آگیا ہو۔

ٹیلی فون خاموش ہو گیا اور وہ سگار کے ہلکے ہلکے کش لگاتے ہوئے دھوئیں کی لکیریں دیکھتے ہوئے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کھڑکی سے نیلے نیلے آکاش میں تیرتے ہوئے سفید سفید بادلوں کے ٹکڑوں کو دیکھ کر اس کے چہرے کے تاثرات موسم کی طرح بدلتے رہے! کبھی وہ بہار کی طرح مسکراتا اور کبھی خزاں کے مانند اداس ہو کر آسمان کو ایسے دیکھنے

لگتا ۔ جیسے کوئی مصور اپنے تصور کو اجاگر کرنے کی کوشش میں ناکام ہوا ہو اور برش تھامے اپنے سامنے کینواس پر بکھرے رنگوں کی گہرائی میں کھو جائے

بادلوں کے ٹکڑے طرح طرح کی شکلیں اختیار کرتے رہے ۔ اور اس کے پراگندہ ذہن کو ان بنتی بگڑتی تصویروں میں کبھی اڑتا ہوا گھوڑا نظر آتا تو کبھی زمین پر اترتی ہوئی پریاں! کبھی لوگوں کو مسلتا ہوا ایک ہاتھی نظر آنے لگتا تو کبھی شیر ببر کی سواری کرتا ہوا ایک بچہ! کبھی ڈولی اٹھائے کہار تو کبھی ادھ جلی چتا سے اٹھتا ہوا دھواں یا دھول اڑاتا ہوا کارواں اور پھر دھول اور دھواں آپس میں گڈ مڈ ہو کر ایک تباہ شدہ طیارہ کی شکل اختیار کر لیتے ۔ طیارے کا خیال آتے ہی اس کی مسکراہٹ ایک بیوہ کی مانگ کے سیندور کی طرح غائب ہو گئی ۔ اور تشویش خوف و افسردگی اس کے احساسات کو اس طرح چھونے لگے جیسے طوفان کا مقابلہ کرتی ہوئی راہ گزر کی آنکھوں میں چبھتے ہوئے ریت کے ذرے!

اچانک فضا میں ایک آواز گونجی اور ایک طیارہ اپنے پیچھے ایک لمبی سی سیڑھی کے مانند دھوئیں کی لکیر چھوڑ کر بادلوں کی اوٹ میں ایسے چھپ گیا جیسے شام کی آغوش میں آفتاب!

دھوئیں کی سیڑھی دیکھتے ہی وہ ایک دم کھڑا ہو گیا جیسے اپنی کھوئی ہوئی منزل تک پہنچنے کا راستہ مل گیا ہو ۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنی فتح کا بگل بجاتا دھوئیں کے نقوش آہستہ آہستہ مٹنے لگے اور وہ دل شکستہ ہو کر چیخ پڑا اس کے ساتھ ہی ایک بار پھر ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی!

کمرے کی خاموشی کو چیرتی ہوئی آوازیں یوں گونجتی رہیں جیسے لوگوں کا ایک ہجوم کسی مفرور آدمی کا پیچھا کر رہا ہو ۔ وہ بھی ایک مفرور آدمی ہے اس لیے گھبرا کر اس نے خالی گلاس وہسکی سے بھر لیا اور غٹاغٹ پی کر ٹیلی فون کو نفرت بھری نگاہوں سے

دیکھنے لگا۔

اس سے پہلے کہ وہ ٹیلی فون کو پھر خاموش کر دیتا۔ بندو ہانپتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور ریسیور کے ساتھ ایسے چپک گئی جیسے نم ہونٹوں سے تشنہ لب!

الفاظ کا انتخاب۔ سوال جواب اور خاص طور پر بندو کا مخصوص انداز بیان برچھی بن کر اس کے سینے کی تہوں کو ایسے کاٹنے لگا جیسے کوئی پکے پھوڑے کو کرید رہا ہو۔ جانے وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ لیکن ہر بار وسکی کے گھونٹ یا سگار کا دھواں الفاظ کو احساس میں بدلتے رہے چند ہی لمحوں کے باعث وہ غٹاغٹ وسکی پیتا رہا۔ اور سگار کا زہریلا دھواں نگلتا رہا۔ اور اس کی ادھ کھلی آنکھیں بندو کو لگاتار گھورتی رہیں۔

بندو ریسیور چھوڑ کر ایک آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے گالوں کی سرخی، ہونٹوں کی تازگی، آنکھوں کا کاجل، سینے کا ابھار اور بالوں کی بناوٹ مختلف زاویوں سے دیکھنے لگی اور وہ اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے کبھی بندو کو دیکھتا تو کبھی ان گنت سگار کے ٹکڑوں کو جو فرش پر ایسے بکھرے پڑے تھے جیسے کسی گھمسان لڑائی کے بعد میدانِ جنگ میں پڑی خون سے لت پت لاشیں!

اس کا حلق سوکھ گیا اپنے گلے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے یوں لگا جیسے وہ بھی لاشوں کے اس ڈھیر میں شامل ہے اور نیم بے ہوشی کی حالت میں پانی! پانی! چلّا رہا ہو۔ احساس کا سلسلہ ٹوٹ گیا تو اس نے پھر گلاس اٹھایا اور چسکیاں لیتے ہوئے دیواروں پر آویزاں خوبصورت تصویریں دیکھتا رہا اس کے اڑائے ہوئے مسافر بردار جہازوں کی تصویریں اور اس کے ماڈل جو سارے کمرے میں سجے ہوئے تھے۔

بندو دروازہ بند کر کے چلی گئی۔ ایک زور کا دھماکہ ہوا۔ کالے بادل آکاش کو دبوچ کر ایسے گرجنے لگے جیسے ایک شیر زخمی شکار کو للکار رہا ہو۔

زور کی بارش شروع ہوئی تو وہ کھڑکی بند کر کے بستر پر لیٹ سا گیا اور چھت کو

ایسے دیکھنے لگا جیسے چوہا ہے پر پکڑا بھٹکا ہوا راہی اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی تاریکی سے ہی پوچھ رہا ہو کہ میری منزل کہاں ہے؟

بے چین ہو کر وہ کولہو کے بیل کی طرح کمرے کے چکر لگاتے لگاتے ایک دم دیوار پر لگی ہوئی اپنی تصویر کے سامنے رُک گیا جیسے کسی غیبی طاقت نے اس کا راستہ روک لیا ہو!

ہاتھ آگے بڑھا کر معنی خیز نظروں سے تصویر کو ایسے دیکھتا رہا جیسے وہ چہرے سے کفن ہٹا کر کسی لاش کی شناخت کر رہا ہو! تصویر رنگین تھی، دلکش بھی، مسکراتے ہوئے بارعب چہرے پر مسرت رقص کر رہی تھی۔ خوبصورتی سے تراشی ہوئی مونچھیں ایک ماہر اور خود اعتماد ہوا باز کے کردار کو بیان کر رہی تھیں جس نے ہر قسم کا جہاز چلایا تھا۔ سینکڑوں سواریوں کو آواز سے بھی زیادہ رفتار کے ساتھ ان کی منزل تک پہنچایا تھا جو خوبصورت دیش بدیش کی خوبصورت ترین ایر ہوسٹسوں میں گھرا رہتا تھا۔

تصویر سے نظریں ہٹیں تو میز پر رکھے ہوئے پیتل کے خوبصورت چمکتے ہوئے طیارے پر رُک گئیں۔ وہ ہونٹ سی کر ایسے رونے لگا جیسے ایک یتیم بچہ اپنے باپ کا فوٹو دیکھ کر رو رہا ہو! آنسو پی کر وہ طیارے کے ماڈل پر یوں ہاتھ پھیرنے لگا جیسے ایک ماں اپنے بچے کے بالوں کو اپنی انگلیوں سے سنوارتے ہوئے تھپکیاں دے دے کر اسے سلانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ خود اپنی کھوئی ہوئی نندیا کو بھی آواز دے رہی ہو۔ اس کے ہونٹ تھرتھرانے لگے۔ آندھی سے کھڑکیاں زور زور سے بجنے لگیں۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے نے دروازے پر لگے ہوئے پردے کو ایسے اُٹھایا جیسے کوئی بردہ فروش کسی حسینہ کے جسم سے چادر ہٹا کر اس کی نمائش کرتے ہوئے بولی لگا رہا ہو۔ دیوار پر لگی ہوئی تصویر فرش پر گر کر چکنا چور ہو گئی اور طیارہ میز سے ایسے گر گیا جیسے چٹکی بجاتے ہی سگریٹ کی راکھ۔ کھڑکی سے جھانک کر جب اس نے سڑک کے کنارے کھڑے

تھرتھراتے درختوں کو دیکھا تو کانپتی ہوئی شاخوں سے پتے ایسے گرتے جا رہے تھے۔ جیسے شعلوں میں لپٹے ہوئے طیارے!

طیارے کے تصور کے ساتھ ہی وہ ایسے ڈگمگانے لگا جیسے وہ کمرے میں نہیں بلکہ ایک گرتے ہوئے طیارے میں بیٹھا اپنے اور طیارے کے بچاؤ کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہو اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے اس نے جونہی کھڑکیاں بند کیں تو پورچ میں کار کا ہارن بجنے لگا۔ آواز سنتے ہی وہ خوفزدہ ہو کر ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگا۔ جیسے اپنے طیارے میں خطرے کا علم ہونے پر فقط اپنے بچاؤ کی کوشش کر رہا ہو۔

کال بیل بجتے ہی اس کے احساسات کا سلسلہ پھر ٹوٹ گیا۔ قدموں کی آہٹ سنتے ہی وہ ایک گیند کی طرح اچھل کر کھڑا ہو گیا اور پھر دیواروں سے یوں ٹکرانے لگا جیسے ایک قیدی زنداں سے بھاگ نکلنے کی کوشش کر رہا ہو۔

سرگوشیوں کی آواز سنتے ہی اس نے پردہ ایسے اٹھایا جیسے وہ گھر میں گھسے چور کو رنگے ہاتھوں پکڑنے میں کامیاب ہوا ہو۔ لیکن بندو کو سامنے دیکھ کر اس کی نظریں شرم سے جھک گئیں۔ بندو اپنے بلاؤز کے ہک کھول رہی تھی اور ایک انجانا شخص قمیض کے بٹن کھول رہا تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی اور وہ ایک شکاری کی طرح اس کے مرمریں جسم کو دیکھتا رہا۔ پر وہ خود بخود گر گیا۔ بادل گرجتے رہے، بارش برستی رہی اور وہ گلاس کو منہ سے لگائے کبھی اپنی تصویریں دیکھتا رہا اور کبھی فرش پر گرے ہوئے طیارے کے ماڈل کو!

بارش تھمی تو جولائی کی گرمی بند کمرے میں بیٹھے دیپک کو نوکیلے کانٹوں کی طرح چبھنے لگی۔ لیکن پھر بھی اس نے نہ تو کھڑکیاں کھولیں اور نہ ہی دروازہ!

اجنبی کی کار پورچ سے نکل گئی تو وہ پردے کو اس طرح دیکھنے لگا جیسے ایک کینسر کا مریض اپنے بارے میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی ڈاکٹر کے خاموش چہرے پر پھیلی ہوئی مصنوعی مسکراہٹ دیکھ رہا ہو۔

جب وہ بندو کے کمرے میں داخل ہوا تو کمرہ خوشبو سے مہک رہا تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ قائم تھی۔ عالی شان بچھونے، چھت پر لٹکتا ہوا شنڈ لیر، پُرکشش صوفے، دلکش پردے اور دیواروں پر لگے ہوئے بے نظیر کینواس۔ لیکن دیپک کو ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی لٹیرا سب کچھ لُوٹ کر لے گیا ہو۔ قالین میں دھنس دھنس کر چلتے ہوئے اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی کھنڈر کے بکھرے ہوئے پتھروں پر چلتے چلتے ڈگمگا رہا ہو۔

فرش پر بکھرے کپڑے زنجیر سے بندھے ہوئے ایک وفادار کتے کی طرح آنکھوں دیکھا حال سُنا رہے تھے۔ بندو کی ساڑھی قالین پر ایسے پڑی تھی جیسے رینگتا ہوا ایک سانپ! بلاؤز ایک زخمی کبوتر کی طرح گویا آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔ انگیا ایسے پڑی تھی جیسے ایک کُچلا ہوا پھول! پیٹی کوٹ یوں پڑا تھا جیسے سر سے الگ کیا ہوا دھڑ!!

کرب و کراہیت سے وہ چیخنے لگا۔ صوفے پر بیٹھتے ہی یوں لگا جیسے وہ ایک بوری میں بند کیے ہوئے بے بس تیراک کی طرح پانی کی تہیں کاٹ کاٹ کر ڈوبتے ہوئے موجوں کا کفن اوڑھ کر پانی ہی کی قبر پر اُترتا چلا جا رہا ہو۔ وہ دائیں بائیں اوپر نیچے کسی کھوئی ہوئی چیز کی تلاش کرتا رہا۔ چھت پر لگے شینڈلیر ایسے لگے جیسے شعلوں میں لپٹے ہوئے طیاروں سے کودے ہوئے ہوا باز جلتی چھتریاں تھامے موت کی جانب جا رہے ہوں۔ لیکن کمرے کے ایک گوشے میں چلمن کے پیچھے مسہری پر بچھی ہوئی سفید سفید چادر کی سلوٹیں ایسے نظر آنے لگیں جیسے ساحل کی طرف آتی ہوئی جھیل کی لہریں!

موجوں کو سینے سے لگانے کی خاطر جونہی وہ ایک چٹان کی طرح کھڑا ہوا تو بندو ایک جوار بھاٹا کی طرح چادر پھینک کر کھڑی ہو گئی۔ اور دیپک کی موجودگی سے بے پرواہو کر اپنے عریاں جسم کو بغیر ڈھانپے سامنے سے یوں گزر گئی جیسے ایک اجنبی راہ گزر! دروازے کو غصے سے ٹھوکر مار کر جب وہ باتھ روم میں گئی تو دیپک ادھ کھلے دروازے سے اسے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے ایک دلِ شکستہ بُت تراش اپنے ہی بنائے ہوئے بُت کو ایک ایسی

اصلی نمائش میں رکھا دیکھ رہا ہو جہاں تماشائی کہنیاں مار مار کر ہجوم کو دائیں بائیں دھکیل کر آگے بڑھتے جا رہے ہوں۔

صابن کی ٹکیا ہاتھ میں لیے جب بندو نے دیپک کو دیکھا تو ٹکیا اس کی گرفت سے ایسے نکل گئی جیسے بہتی ہوئی ندی میں مچھیرے کی گرفت سے پھسلی ہوئی مچھلی! بے رخی اور نفرت کے ملے جلے احساسات کا اظہار کرتے ہوئے بندو اپنے مرمریں جسم کی پوشیدہ جگہوں کو یوں مسلنے لگی گویا وہ کسی کو قتل کرنے کے بعد خون کے دھبے صاف کر رہی تھی۔

اچانک جب مدہوش دیپک اپنا توازن کھو کر گرنے ہی لگا تھا تو بندو نے اسے سنبھالا دیا اور اس کے بے ہوش جسم کو گھسیٹ کر بستر پر لٹا دیا۔ پاس بیٹھ کر اپنے جسم سے صابن کا جھاگ ہٹاتے ہوئے پرنالے کی طرح بہتے ہوئے پانی کے قطروں کو دیکھنے لگی۔ کبھی وہ آہ بھر کر دیپک کے خاموش چہرے کو دیکھتی تو کبھی دیوار پر آویزاں دیپک کی تصویریں! کبھی وہ ٹیلی فون کو دیکھتی رہی اور کبھی سڑک کے کنارے چلتے ہوئے ایک خوش حال پریوار کو۔ کبھی وہ اپنی تصویریں دیکھنے لگی تو کبھی سامنے قدِ آدم آئینہ میں اپنا صاف و شفاف جسم! یادیں اس کے ذہن میں یوں اُچھلنے لگیں جیسے بڑے بڑے پتھروں سے ٹکراتا ہوا پانی!

بادل پھر گرجنے لگے۔ ہوا کے جھونکوں سے دروازے، کھڑکیاں ہلنے لگیں۔ بندو کو ایسا لگا جیسے گاہک دکان کے دروازے توڑ کر مال خریدنے پر بضد ہوں۔ اپنے آپ سے گھبرا کر وہ اپنے شوہر ریٹائرڈ کمرشیل ٹیسٹ پائلٹ دیپک لون کے سینے سے لپٹ گئی اور ٹیلی فون کا ریسیور اُتار کر وہ ایک تھکے راہی کی طرح سو گئی۔

گئی رات جب دیپک کو ہوش آیا تو بندو کے نیم سفید بال، اس کی چوڑی چھاتی پر ایسے بکھرے پڑے تھے جیسے کوئی زخمی پرندہ اپنے گھونسلے میں پناہ لے کر اطمینان سے سانس لے رہا ہو۔ سفید بالوں کو دیکھ کر وہ چونک پڑا اور ایک باغی کی طرح جونہی وہ

کھڑا ہو گیا بندو نے آنکھ کھولی اور ملتجی نظروں سے دیپک کو دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں شکوے تھے، شکایتیں بھی لبوں پر فریاد بھی، لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی دیپک کا ہاتھ طیارے کے ماڈل پر رُک گیا۔ ایک جانی پہچانی کیفیت طاری ہو گئی اور وہ اپنی کٹی ہوئی ٹانگ کو ہلاتے اور دوسری ٹانگ پر لڑکھڑاتے یوں چلّانے لگا جیسے وہ آسمان سے گر کر تیزی سے نیچے آرہا ہو۔ بندو نے الماری کا دروازہ کھولا تو دیپک نے شراب کی نئی بوتل نکال لی اور فرش پر ہی لیٹ گیا۔ اور فرش پر گرے ہوئے اپنے آخری طیارے کے ماڈل پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بوتل کو منہ سے لگا کر اس طرح شراب پینے لگا جیسے کوئی بچہ بوتل سے دودھ پیتے ہوئے بھی اپنی ماں کی چھاتی پر ہاتھ پھیر رہا ہو۔

دیپک نیم بے ہوشی کی حالت میں بڑبڑا رہا تھا۔ غالباً اُڑان کے بارے میں کچھ سگنل وغیرہ دے رہا تھا جب کہ بندو فرش سے سگار کے ٹکڑے وہسکی کی خالی بوتلیں اُٹھاتے ہوئے ایسے چل رہی تھی جیسے پانی کے بہاؤ کے ساتھ سوکھے پتّے۔

ایک آہ بھر کر اُس نے اپنے نیم سفید بالوں کو ایک بہت خوبصورت سنہری رنگ کی وِگ سے ڈھانپ لیا اور کبھی اپنے شوہر کو اور کبھی وہسکی کی خالی بوتلوں کو دیکھ کر ٹیلی فون کے قریب بیٹھی مینڈکوں کے ٹرانے کی آواز سنتی رہی۔ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بج اُٹھی اور ریسیور اُٹھاتے ہی بندو کے لبوں کی تھرتھراہٹ ختم ہو گئی لب و لہجہ بدل گیا۔ طور طریقہ بدل گیا اور قہقہوں اور بازاری مکالموں کے تودوں کے نیچے اس کا احساس فرض کا کفن اوڑھ کر دفن ہوا! جب کہ دیپک لگاتار ایسے ہاتھ پاؤں ہلا مار رہا جیسے اُونچی اُڑان میں مصروف ہو!!

کل کیا ہوگا...

ڈاکٹر پریہ درشنی جب باہر آئی تو برآمدے میں کھڑے لوگ اس کے چہرے پر چھائے ہوئے تشویش کے تاثرات کو دیکھنے کے بجائے اس ٹیپ رکارڈ کو ڈھونڈتے رہے جس میں اس عورت کا نہایت اہم ریکارڈ بیان کیا گیا تھا۔ جس کو وہ لوگ چند لمحات سے نہایت اعزاز و احترام کے ساتھ ایک بھاری جلوس کی شکل میں ہسپتال لے آئے تھے۔

اس عورت کو ڈاکٹر پریہ درشنی نے پہلے بھی کئی بار دیکھا تھا۔ کہاں کہاں یہ اسے یاد نہیں آرہا تھا۔ شاید کسی دُور دراز پہاڑی علاقے میں، کسی بیابان میں کسی گاؤں کے کھیتوں میں یا پھر کسی شہر کی سڑکوں پر ——— لیکن اس بار ڈرامائی انداز میں چند معزز جانے پہچانے لوگوں کے درمیان منچ پر دیکھ کر وہ حیران بھی ہوئی تھی اور سنجیدہ پریشان بھی۔

اس عورت کی عجیب و غریب کیفیت دیکھ کر ڈاکٹر پریہ درشنی نے اس کے قریب جانے

کی بہت کوشش کی تھی مگر دونوں کے درمیان ایک بہت بڑا اجتماع تھا۔ لاکھوں لوگ منچ کی طرف یوں دیکھ رہے تھے جیسے فوجی جوان اپنے کمانڈر کے حکم کا انتظار کر رہے ہوں۔ اس وسیع میدان میں جنگ نہ سہی مگر ایک زبردست جہاد کی تیاریاں ہو رہی تھیں ——— نیتاؤں نے زرہ بکتر نہ سہی اپنے اپنے مخصوص لباس ضرور پہن رکھے تھے۔ اور اپنے رتھ کا بار بار احساس دلا کر وہ اس جنگ کا ذکر کرتے تھے جو وہ لڑنے جا رہے تھے۔ نیکی اور بدی کی جنگ! اور آج ہزاروں سال بعد پھر دروپدی کو ننگا کر دیا گیا ہے اور کوئی بھی غیرت مند دیش واسی یہ ظلم، یہ تشدد اور ایک واحد شخص کی بربریت برداشت نہیں کر سکتا ——— "اور ہم دروپدی کے اپمان کا ضرور بدلہ لیں گے۔"

وہ عورت درد کی شدت سے تڑپ رہی تھی اور یہ دیکھ کر ڈاکٹر پریہ درشنی نے چند لوگوں کو آگے پیچھے ڈھکیل کر منچ کے قریب پہنچنا چاہا۔ کچھ زور سے کہنا چاہا مگر لیڈر کی گرجتی ہوئی آوازیں اور فلک شگاف نعروں نے اس کی آواز کو یوں دبوچ لیا تھا گویا ایک عقاب کے پنجوں میں اپنے پر پھڑپھڑاتا ہوا ایک سفید کبوتر ——— تب وہ بے بس ہو کر اپنی ایمبولینس گاڑی میں بیٹھ کر شیشوں سے جھانک کر کبھی لوگوں کو دیکھتی، کبھی لیڈران کو دیکھتی کبھی منچ کے ارد گرد بیرونی ممالک کے باشندوں کے جانے پہچانے چہروں کو دیکھتی اور کبھی اس عورت کو دیکھتی جو اپنے تن پر پہنے ہوئے کپڑوں سے اپنے جسم کے پوشیدہ حصوں کو چھپانے کی یوں کوشش کر رہی تھی گویا کوئی چھوٹی سی چادر سے اپنے لمبے جسم کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہو ——— ساڑھی کے بڑے بڑے چھید اور بلاؤز دبیز کوٹ کے دریچوں سے اس عورت کا دکھ جھانک جھانک کر میدان میں کھڑے لوگوں کو اس داستان ستم کی تصویر بیاں کر رہا تھا۔ جس کو بیان کرتے کرتے کچھ مقرر طیش میں آ کر اعلانِ جنگ کرتے رہے اور کچھ لیڈران فلسفیانہ انداز میں پُر امن جہاد کرنے کی صلاح دیتے رہے۔ آوازیں گویا ہوا کے رُخ کا سہارا لے کر ملک کے حدود کے باہر بھی جا رہی تھیں۔

" دروپدی کو کوروؤں نے رُسوا کیا تھا۔ یہ مَیں نہیں کہہ رہا ہوں تاریخ بیان کررہی ہے۔"

"——— اور کوروؤں کا راج ظلم اور جبر کا راج تھا۔"

"——— دریودھن کی بربریت ——— ایک واحد شخص کی ڈکٹیٹر شپ۔"

"——— اور جب صبر کا پیمانہ لبریز ہوا تھا تب دھرم راج یدھشٹر نے بھی ہتھیار اُٹھا لیے تھے اور آج بھی دھرم راج ———"

"——— ضرورت تو اس بات کی ہے کہ دروپدی کو ننگا کر دینے والوں کو الف ننگا کر دیا جائے۔"

"——— اس حکومت کو اُلٹا دو ———"

"باتوں سے نہیں ——— لاتوں سے۔"

"دھرم یدھ میں توڑ پھوڑ جائز ہے۔"

"ریلوں کو اُڑا دو۔ فیکٹریوں کو آگ لگا دو۔"

"موم کے محل بنا کر پھونک دو حکمراں طبقے کو۔"

"ہڑتال۔ گھیراؤ ———"

"سرکاری کام مفلوج کر دو!

"ضرورت پڑی تو دوست ملکوں سے مدد لیں گے۔"

"ہمارے ساتھ کسان ہیں۔"

"ہمارے ساتھ فوج کے جوان ہیں۔"

"ظالموں نے دروپدی کو ننگا کر دیا سرِ بازار ——— ببانگِ دہل ——— فقط اس لیے کہ اس کا تعلق حاکموں سے نہیں ہم سے ہے۔ آپ سے ہے۔"

"دروپدی آپ کے سامنے کھڑی ہے۔ ننگی!"

"دروپدی ہماری ماں ہے۔ بہن ہے۔ بیٹی ہے۔"

"بھارت کے غیرت مند ویرسپوتو فیصلہ ہو چکا ہے۔"

"——— یدھ شروع ہے۔ نیا سنگرام، نیا بھارت۔"

اور ہوا یوں کہ ایک واقعہ قصہ بن کر جب مواد فراہم کرنے لگا تو یہ عورت صحافت کا موضوع بن گئی ——— ان کے سہارے لیڈر مان مہارتی بن کر جنگ کے بارے میں غور و خوض کرتے رہے۔ طاقت کا توازن ——— مہارتھیوں کا تناسب۔ نئی حکمتِ عملی کا حوالہ دے کر کوئی خود ساختہ ہنومان بن گیا۔ کوئی ارجن کوئی بھیشم پتامہ اور کوئی کل یُگ کا مسیحا بن کر مشورے دیتا رہا۔ ہدایتیں دیتا رہا۔

اس دوران یہ عورت کچھ بڑبڑاتی رہی تو دھو کھڑے لوگ سمجھتے رہے کہ معصوم عورت اپنی داستانِ غم سسک سسک کر سنا رہی ہے۔ ریپ کی واردات اور پھر سانحہ کی تفصیل بہ زبانِ خود بتا رہی ہے۔ اپنے ارد گرد چہروں کا ایک جنگل دیکھ کر جب اس پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی تو وہ چند معیوب حرکتیں کرتی ہوئی یوں بے بس ہو گئی کہ وہ اپنے جسم کے عریاں حصّوں کو چھپانے کی ہر کوشش میں ناکام ہو گئی ——— اپنے تھرتھراتے ہونٹوں کو دانتوں سے پکڑ کر شاید وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کچھ کہنے کے بجائے یا آس پاس کھڑے لوگوں کے سوالات کے جوابات دینے کے بجائے وہ ملتجی نظروں سے یوں دیکھتی رہی گویا کسی شناسا چہرے کی تلاش کر رہی ہو۔

عورت کی حالت دیکھ کر جنس زدہ لوگوں کے دل بھی ہلنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک آتش فشاں پہاڑ پھٹ چکا تھا۔ عورت کے عریاں جسم پر لوگوں نے کپڑے پھینک دیے کسی نے اپنا قیمتی شال کسی نے کوٹ۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اسٹیج پر اتنے کپڑے پھینکے گئے کہ وہ عورت ملبوسات کے انبار کے نیچے دب گئی۔

"ـــــــ ظلم کی انتہا ـــــــ جہاد کا آغاز"

"ـــــــ گناہوں کی انتہا ـــــــ ایک نئے اوتار کا جنم"

"دروپدی کا وستر ہرن اور نیا مہابھارت"

"جھوٹ فریب - بربریت - مکّاری کا خاتمہ اور ایک نیا راج"

خبر سارے ملک میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی اور مہارتھی اپنی پالیسی منصوبہ بندی اور کارکردگی سے مطمئن نظر آرہے تھے۔ گویا ایک فتح دوسری فتوحات کا یقین دلا رہی تھی۔

اچانک وہ عورت چیخ پڑی اور اس کے اوپر ڈالے گئے کپڑے اچھل کر یوں دور جا گرے گویا آتش فشاں پہاڑ کا لاوا۔ مگر اگلے ہی لمحے وہ عورت خاموش ہوگئی۔ شاید وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔

"دروپدی تڑپ رہی ہے اور میرا خون اُبل رہا ہے"

"ـــــــ دروپدی کی عزت لوٹنے والو۔ تمھارا یوم حساب آ چکا ہے"

اور یہ کہہ کر وہ لوگ عورت کو ایک بھاری جلوس کی شکل میں لے کر نعرے لگاتے رہے۔ جب کہ ڈاکٹر پریہ درشنی اپنے آنسو پونچھ کر یہی سوچتی رہی کہ یہ لوگ اس مریضہ کو کہاں لے جارہے ہیں۔

ایک چوراہے پر جلوس ایک عظیم جلسے کی شکل اختیار کر گیا۔ وہی ہنگامے وہی تقریریں وہی نعرے انتقامی منصوبے وہی کارکردگی۔ وہی شور وغل۔

دیکھتے ہی دیکھتے تمام راستے بند ہوگئے۔ اور ایک مظلوم عورت کی آہ وزاریاں نعروں کی گونج کے آگے دب گئیں۔

ڈاکٹر پریہ درشنی اپنے ہسپتال کے برآمدے میں یہ تماشہ دیکھ رہی تھی۔

اچانک لوگوں کے بھاری ہجوم کو چیرتے ہوئے چند لوگ دروپدی کو کندھے پر

اُٹھا کر ہسپتال کی طرف آنے لگے تو ڈاکٹر پریہ درشنی کو یوں محسوس ہوا جیسے ماہر تیراک ایک ڈوبتی ہوئی عورت کو سمندر کی عمیق گہرائی سے باہر نکال لائے ہوں۔

مگر مریضہ کی کلائی پکڑ کر جب اس نے بعد ازاں میں برپا شور و غل سُنا تب وہ یوں چونک پڑی گویا کوئی موت کے ساتھ لڑتے ہوئے مریض کی ناک سے آکسیجن کا پائپ کھینچ رہا ہو۔

لیڈران بضد تھے کہ مریضہ کا بیان قلم بند کیا جائے۔ ان کے دباؤ کے وزن میں مظاہروں کا بوجھ تھا۔ توڑ پھوڑ کے ہتھیار تھے۔ حمایتوں کی طاقت تھی۔ ہوا کا رُخ تھا۔ اور غیر ملکی دانش وروں کا دخل بھی تھا۔ آخری فیصلہ یہ ہوا کہ مریضہ کا بیان —— INTENSIV CARE میں جا کر ٹیپ کیا جائے تاکہ بے چین عوام کو صورتِ حال سے آگاہ کیا جائے۔ فیصلہ کا احترام کرتے ہوئے ڈاکٹر پریہ درشنی جب بیان ریکارڈ کر کے باہر چلی آئی تب ایک زبردست کھلبلی مچ گئی۔ ہر ایک لیڈر کی یہی خواہش تھی کہ وہ ریکارڈ اُٹھا کر لے جائے تاکہ دروپدی کے احساسات جذبات و خیالات کو عوام کے سامنے رکھنے کا شرف حاصل کر سکے۔ اس کوشش میں وہ ایک دوسرے سے لڑتے رہے جیسے تخت کے لیے جانشینوں کی جنگ۔

یہ دیکھ کر ڈاکٹر پریہ درشنی نے سوئچ آن کر دیا تو ایک نسوانی پُرسوز آواز سُن کر ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ لوگ بیان کا ایک ایک لفظ یوں سنتے رہے گویا ریڈیو پر نہایت اہم خبروں کا بلیٹن سُن رہے ہوں یا کسی انتخاب کے نتائج سُن رہے ہوں۔ مگر عورت کا بیان سُن کر لیڈروں کا جوش و خروش اچانک یوں ٹھنڈا ہو گیا جیسے دہکتے ہوئے انگاروں کو پانی میں ڈال دیا گیا تھا اور وہ سب ایک دوسرے کے چہرے کو یوں دیکھتے رہے جیسے پانی کی سطح پر تیرتے ہوئے موٹے مگر ہلکے ہلکے کوئلے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں۔

سرگوشیاں جب شور و غل میں بدل گئیں تب لوگ ایک دوسرے سے باتیں کرتے

رہے۔

"یہ کیسی عجیب داستان ہے۔

"گویا یہ فریب تھا"

"گویا دھوکہ تھا"

"دروپدی کہتی ہے کہ کسی نے بھی اس کی عزت نہیں لوٹی ہے"

"اور کسی نے اسے اغوا نہیں کیا ہے"

"کسی نے اس کو ننگا نہیں کیا ہے"

"پھر یہ سب کیا ہے ——"

"مگر یہ عورت دروپدی تو نہیں ہے"

"کون ہے یہ عورت ——"

"اپنا نام شکنتلا بتا رہی ہے"

"لوگو! —— خبردار!! —— یہ عورت دروپدی نہیں ہے۔ وہ عورت جس کو حاکموں نے سربازار ننگا کر دیا ہے۔ جس کی عزت ظالموں نے لوٹ لی ہے —— وہ نہیں ہے یہ کوئی معمولی عورت ہے جس کو دیکھنے کے لیے آپ بے چین ہیں وہ یہ نہیں ہے —— وہ اس وقت رام لیلا گراؤنڈ میں پہنچ چکی ہے۔ دیکھتے کیا ہو لوگو! —— چلو۔ دہلی چلیں۔!!

ایک لیڈر نے چیخ کر کہا۔

"چلو دہلی چلیں۔ آج ہمارے قدم کوئی نہیں روک سکتا۔ ہم اس سرکار کو نہیں چلنے دیں گے۔ ہم یہ آخری جنگ ضرور لڑیں گے۔ یہ جنگ کوروکشیتر کے میدان میں نہیں۔ ہر گھر ہر گلی کوچے میں لڑی جائے گی۔"

دوسرا لیڈر بہ آواز بلند کہتا رہا گویا ایک بازی ہار کر وہ ایک اور فیصلہ کن

شطرنج کی بازی کھیلنے کی اطلاع دے رہا ہو۔

مگر لوگوں میں کھلبلی مچ گئی اور یوں محسوس ہوتا رہا جیسے جنگجو ہاتھی اپنے ہی سپہ سالاروں کو مسلنے لگے تھے۔

کچھ نے کہا یہ دھرم یدھ ہے ——— نیا مہا بھارت۔

کچھ نے کہا یہ ہنگامہ ہے۔ نیا ہنگامہ بھارت کی سیاست کا۔

شکنتلا ایک بیکار بم کے خول کی طرح ہسپتال کے ایک گوشے میں پڑی تھی۔ اور بند کمروں میں گفت و شنید کرنے والے لیڈروں کو دروپدی کا غم کھائے جا رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہی ان کے منصوبے کو عملی جامہ پہنا کر نقشے کو فساد کی شکل دے کر ایک اور جنگ کی شروعات کر سکتی تھی۔

پریشان حال لوگوں کو یوں محسوس ہوتا رہا جیسے چاروں طرف دھند پھیلا ہے۔ اور وہ راستہ تلاش کر رہے ہوں۔

شکنتلا آخری سانسیں لے رہی تھی اور ڈاکٹر اندرا پریہ درشنی شکنتلا کے نوزائیدہ بچے بھرت کو سینے سے لگا کر سوچتی رہی کہ اگر آج یہ حالت ہے تو پھر کل کیا ہوگا۔

پھر وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے ہسپتال کے خالی برآمدے کو یوں دیکھتی رہی، گویا جھانک کر بھارت کا مستقبل دیکھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

چند قابلِ مطالعہ کتابیں

ناول

پاکستان ایکسپریس	خشونت سنگھ	-/۳۰
جزیرہ	م۔ک۔ مہتاب	-/۳۵
دُوسری منزل	امرتا پریتم	-/۳۰
آنگن (مع مقدمہ)	خدیجہ مستور	-/۳۰
ترے کوچے سے ہم نکلے	عطیہ پروین	-/۲۵
گریز	عزیز احمد	-/۳۵
جاتی ہوئی رُت	کشمیری لال ذاکر	-/۲۵
عداوت	بالا دُوبے	-/۲۵
نگارینہ	ثریا محمود نصرت	-/۲۵
ناظرہ	ہاجرہ نازلی	-/۲۵
مَیں بُوند بُوند زہر پیتا ہوں	موہن لال	-/۲۰
پت جھڑ کے مُسافر	مصوّر سبزواری	-/۳۰

افسانے

جو کہا نہیں جاتا	عظیم اقبال	-/۲۵
پیڑوں والا فقیر	کشمیری لال ذاکر	-/۲۵
پنجرے کے پنچھی	مانک ٹالا	-/۳۵
آخری دن (ڈرامے)	دیویندر پٹواری	-/۳۵
ہمگدڑ مادوی (انشائیے)	ایم، اے، وحید	-/۱۸

موڈرن پبلشنگ ہاؤس

۹، گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲-